سلسلہ نمائش بلند شہر

حصّہ دوم

تذکرہ شعرائے بلند شہر

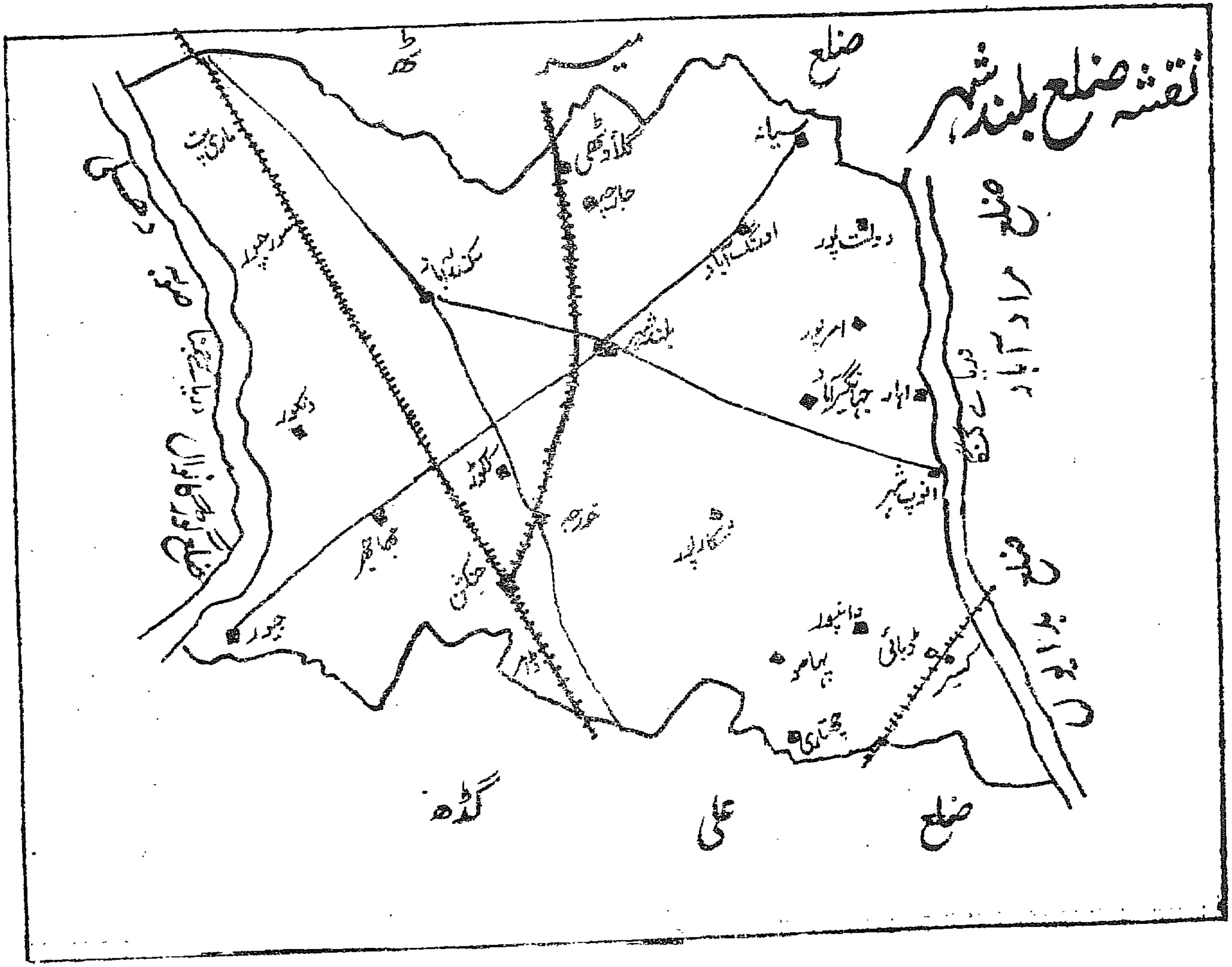
مرتّب

سیّد حامد

معاون

خضر برنی

قیمت ؏؍



نقشہ ضلع بلند شہر
ضلع میرٹھ
ضلع علی گڑھ
ضلع مراد آباد
ضلع بدایوں
دریائے گنگ
بلند شہر
سکندرآباد
انوپ شہر
خورجہ
سیانہ
جہانگیرآباد
دولت پور
شکارپور
ڈبائی
پہاسو
جیور

فہرست

بانگ نو

گذارش

"گویا آپ" رشید صاحب[1] نے مسکراتے ہوئے مربیانہ طنز کے ساتھ کہا "ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کی طرح جہاں جاتے ہیں وہاں کی تاریخ ضرور مرتب کرتے ہیں" یہ تبصرہ تھا "قوسِ قزح" پر جو اس سلسلہ کی پہلی جلد تھی اس میں بجنور کے "گلدستہ" کی طرف بھی اشارہ تھا، اور زیر نظر مجموعہ کی روایت بھی جس کا تذکرہ "قوسِ قزح" کے پیش لفظ میں آچکا ہے۔

دراصل تاریخ میں مجھے اتنا دخل بھی نہیں ہے جتنا تنقید میں۔ تنقید میں جتنا دخل ہے وہ ظاہر ہے۔ شاید ہی کسی زبان میں شاعری کو وہ قبول عام حاصل ہوا ہو جو اردو شاعری کو یو۔پی میں میسر ہے کسی شائستہ صحبت میں بیٹھیے۔ ہر پانچواں آدمی شاعر ہوگا، شعرا کی اس کثرت کو حقارت یا استہزا کی نظر سے دیکھیے۔ تسلیم کہ ان میں سے بیشتر محض رسمی اشعار کہتے ہیں، اکثر کے اشعار فنی اعتبار سے ناقص ہوتے ہیں، ان کی فرسودگی بعض اوقات صبر آزما ہو جاتی ہے، یہ بھی تسلیم کہ شاعروں کی باہمی رقابت اور چشمکیں کبھی کبھی ناخوشگوار اور غیر سنجیدہ پہلو اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کی معاصرانہ کدورتیں پستی کا دامن تھام لیتی ہیں۔ خود پرستی کا شیوہ بن جاتی ہیں۔ اور تنگ نظری ان کا شعار۔ یہ بھی تسلیم کہ اکثر وہ اپنے ملکۂ شعر کو فرمائش کے تابع کر دیتے ہیں اور کہیں کہیں اغراض کا آلۂ کار۔

لیکن یہ بھی تو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ شعرا کی کثیر تعداد اس کی ضامن ہے کہ عوام میں شعر کا مذاق برا بھلا جیسا کچھ بھی ہو باقی رہے۔ زبان کی ترویج اور قبول عام میں مشاہیر سے کہیں زیادہ ان گمنام اور محض "مقامی" شعرا کا حصہ ہے، جنھیں حقارت کی نظر سے دیکھنے کا رجحان بیش ہوتا جا رہا ہے۔ موجودہ دور کے مشاعرہ کی ادبی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی

---

[1] پروفیسر رشید احمد صدیقی

لسانی اہمیت حالات کے ناسازگار ہونے کے ساتھ ساتھ اور بڑھتی جا رہی ہے، یہ امر بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ دربارون کی سرپرستی کے دور اور پریس اور سینما سے وابستگی کے عہد کے مابین جو دور گذرا ہے اس میں (ایک حد تک) مشاعرہ ہی شعرا کی معاش کا کفیل بنا۔ اور متقدمین اور متاخرین کے دور میں تو مشاعرہ کی داد شعر کے حسن و قبح کا معیار سمجھی جاتی تھی جوش اس عہد میں ہوتے تو یہ نہ کہتے ؎

ملتی ہے مشاعرہ میں جس شعر کی داد وہ شعر مری نظر سے گر جاتا ہے

ذرا سی فراخدلی سے دیکھئے تو ان شاعروں میں بھی جنھیں ہم تنگ نظر اور بر خود غلط کہتے ہیں کردار و رفتار کے بعض بیش بہا جوہر نظر آئینگے، اوّل تو وہ اعتماد ہے جو ترقی کیلئے ناگزیر ہوتا ہے پھر غیرتِ نفس کا احساس ہے جو ہر شاعر میں نہیں لیکن ہر شہر کے مقامی اساتذہ میں ضرور ملیگا۔ وہ اپنی عام حیثیت سے علیحدہ بحیثیت شاعر کے اپنے منصب کی عظمت کو جانتے ہیں اور اس کے تحفظ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، حفظِ وضع کا درس کوئی ان سے لے، اس طبقہ میں ایسے نفوس بھی ہیں جو کسی بھاؤ اپنے مستقر سے ہل کر نہیں دیتے، معاصرانہ چشمکوں میں بھی آپ انھیں تہذیب سے متجاوز نہ دیکھئے گا۔ یہ لوگ تعلقات کو مرتے دم تک نباہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان میں ہمارے پرانے وضعدار بزرگوں کی جملہ خوبیاں ملتی ہیں۔ اور اپنے منصب کی رفعت کا احساس اس پر مستزاد۔ ان مقامی اساتذہ کو جن سے باہر والے نا آشنا ہیں آپ بعض سیّار شعرا کی طرح مشاعرہ کے انتظام پر نکتہ چینیاں کرتے ہوئے نہ دیکھیں گے، نہ ہمعصروں پر پھبتیاں کستے ہوئے کسی ہمعصر کی غزل کی کامیابی کو آواز ترنم سرقہ یا اخذ یا سامعین کی بد ذوقی پر محمول نہیں کرتے یہ بزرگ اس تمدن کی آغوش میں پلے ہیں جو ہمارے عہد میں سانس توڑ رہا ہے آپ ان کو مال و جاہ سے مرعوب نہیں کر سکتے، ان سے جھک کر ملئے اور یہ آپکے مرید ہو جائیں گے، ان اوصاف کے ساتھ

ان کی روایتی تنک مزاجی (کہ وہ بھی عزتِ نفس کا ایک پہلو ہے) گوارا ہو جاتی ہے۔

ہمارے شہروں اور قصبات کے مقامی شعرا کا اوڑھنا بچھونا غزل ہے، غزل پر بیشمار حملے ہوئے ہیں، وہ ان سے جانبر ہو گئی ہے، یہی غزل کے ایک زندہ صنف ہونے کا ثبوت ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صنفِ سخن محدود ذخیرۂ الفاظ اور بندھے ٹکے رسمی مضامین اور قافیہ کی قید اور ردیف کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی ہے لیکن اسکی ایسی طاقتیں اور محاسن ہیں جن سے انکار کرنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

اس رباعی میں جوش نے غزل کے متفرق اور غیر مسلسل اشعار کو ہدف بنایا ہے:۔

دیکھا ہی نہیں ایسا پراگندہ پڑاؤ
کھلتا ہی نہیں غزل کے اشعار کا بھاؤ
اک دوسرے سے بیٹھے ہیں منھ کو موڑے
کیسی یہ برادری ہے للّٰہ بتاؤ

غزل کے اشعار ایک دوسرے سے منھ کو موڑے ہوئے بیٹھے ہوں، تو بھی مشتاق کن انکھیوں سے باہم دگر نظر کناں ہیں ؎

وہ اک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

حیرت ہے کہ وہ گوشۂ چشم وہ نیم نگاہ جوش جیسے اہلِ نظر سے مخفی رہے، بہرحال غزل کے اشعار کا باہم دگر منھ موڑ کر بیٹھنا وہ منھ موڑنا نہیں جو خود جوش نے غزل کی طرف روا رکھا ہے۔ غزل کی صوتی ہم آہنگی کی طرح اس کی معنوی یگانگت بھی اہل نقد و نظر کے نزدیک مسلّم ہے۔ وہ یگانگت جو اخفا کی لطافتوں کی حامل ہے۔

مرتّب کے ایک دوست نے جو اچھی نظر ادب اور تنقید میں رکھتے ہیں اس مجموعہ کی تدوین کو سعی رائیگاں سمجھتے ہوئے فہمائش بھی کی۔ مگر میں اس قدر آگے نکل چکا تھا کہ بازگشت دشوار تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کام کو میں حوصلہ اور آرزو کی استطاعت کے مطابق بھی انجام نہ دے سکا۔ اگست کے شروع میں مجھے تبدیل ہو کر دیوریا آنا پڑا۔ اور ان منتشر اوراق کی شیرازہ بندی

خضر صاحب کے سپرد ہوئی، خود ان کو بھی دیگر مشاغل نے گھیرے رکھا۔ مجھے علم نہیں کہ ترتیب کیا رکھی گئی اور پروف دیکھنے میں کیا کاوش کی گئی۔ اغلاط و اسقام سے چشم پوشی کا طالب ہوں وہ میرے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں، کیونکہ خضر صاحب نے شروع میں میری رائے کا اتباع کیا خود ان کی رائے معرض عمل میں جب آئی جب ترمیم اور اصلاح کا زیادہ موقع نہیں رہا تھا، یو۔ پی کے مغرب بعید میں بلند شہر ہے اور مشرق بعید میں دیوریا۔ ہم دونوں نے کوشش بھی کی کہ ڈاک کو قاصد بنایا جائے، لیکن کچھ تو پانسو میل کی مسافت، اور کچھ یہ پرآشوب ایام، ایک نہ چلی۔ دیوریا سے صرف شیفتہ اور تفتہ کے دواوین کا انتخاب اور ان کے حالات لکھ کر بھیج سکا۔ بعض شعرا کے حالات کی تصویر کشی میں "قوس قزح" کے رنگ چرائے ہیں، بعض کے حالات اسی مجموعہ کے لئے لکھے ہیں۔ اکثر شعرا کے خودنوشت حالات میں قطع و برید کی ہے، اور چند صورتوں میں خودنوشت حالات کو بعینہٖ نقل کر دیا گیا ہے، جیسے شاید ماہر القادری کی ضمن میں۔ انتخاب بیشتر میرا کیا ہوا ہے، کچھ خضر صاحب کا اور کچھ غالباً بدر جلالی صاحب کا، انتخاب میں اشعار کی کثرت یا قلت شاعر کے مرتبہ کا آئینہ نہیں ہے۔

اس جماعت کے امام نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور منشی ہرگوپال تفتہ ہیں۔ ان کے عصر سے لیکر موجودہ دور تک کے شعرا کا کلام اس مجموعہ میں شامل ہے۔

موجودہ دور کے بعض مشاہیر شعرا بھی اس صحبت میں جلوہ گر نظر آئیں گے کہ ان کا خمیر اسی سرزمین سے ہے۔

اس کتاب کی ادبی اہمیت کے متعلق میں کسی فریب میں مبتلا نہیں ہوں، لیکن وقت کی انوکھی رفتار سے کیا یہ موہوم امید نہیں کی جاسکتی کہ آج سے ایک صدی یا نصف صدی بعد یہ پرزہ (بشرطیکہ کوئی نسخہ وقت کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا) اگر تاریخ سے دلچسپی

رکھنے والے ہاتھوں میں پڑ گئے تو ایک نئی سمت سے کار آمد ثابت ہوں گے، ان سے ایک طرف اس دور میں اُردو زبان اور اس کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ ہم اس محفل میں ہر طبقہ، ہر عمر، ہر پیشہ اور ہر حیثیت کے شعرا کو یکجا دیکھ رہے ہیں۔

ان میں ریاستوں کے نمائندے بھی ہیں، اور ہندوستان خاص کے بھی ہندو، مسلمان، عامل۔ جاہل۔ وکیل۔ مختار۔ طالب علم۔ استاد۔ حکیم۔ ڈاکٹر۔ محرّر۔ عرائض نویس۔ اہن جج۔ چپراسی۔ زمیندار۔ دوکاندار۔ مختار عام۔ جرنلسٹ۔ خطّاط۔ نواب۔ مصاحب۔ مُطرب۔ سائنسداں غرضیکہ سوسائٹی کا ہر طبقہ ملے گا۔ یہ گویا ہماری بوقلموں سوسائٹی کا ایک کراس سیکشن ہے۔

دوسری طرف مورّخ ادب کو انیسویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں یو۔پی کے شہروں میں شاعری کا عام معیار کیا تھا، اس پہلو پر اساتذہ کے دواوین زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتے، ایسے مجموعوں کی ضرورت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ یو۔پی میں یہ بساط الٹی جا رہی ہے اور احتمال یہ ہے کہ یہ باتیں ہماری آئندہ نسل کے تجربہ میں شاید نہ آئیں۔

ہمارے شعرا کے خلاف ایک عام الزام یہ ہے کہ وہ پُر گو ہیں، اُن کی غزلیں بھرتی کے اشعار سے پُر ہیں۔ یہ الزام بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن زندگی باوجود یکرنگی کے متنوع ہے۔ ہر فرد کی زندگی میں کچھ تجربات، کچھ روایات ایسے ہوتے ہیں جنھیں صرف وہی محسوس کرتا ہے، ہمارا شاعر جب ان واردات کو ادا کرتا ہے تو وہ ہمیں ایک نئی دولت بخشتا ہے۔ اور جب وہ کسی پُرانے خیال کو بالکل نئے انداز سے باندھتا ہے تو قارئین کو ایک مخصوص حظّ میسّر آتا ہے۔ ہر شاعر کے دیوان میں ایسے چند شعر ضرور نکلیں گے۔ افسوس کہ یہ جواہر ریزے

رہی اور تقلیدی اشعار کے سنگ و خشت کے نیچے دب کر تلف ہو جاتے ہیں ۔ ان کو الگ نکال کر محفوظ کر لینا ہمارا فرض ہے ۔ غور کیجئے ہماری شاعری کی دو قرن کی تاریخ میں کیا کچھ نہ تلف ہو گیا ہوگا ۔

یہ کتاب سلسلۂ نمائش بلند شہر کی دوسری جلد ہے ۔ اس کا پہلا حصہ "قوس قزح" کے نام سے چھپا تھا ، پہلی جلد میں بلند شہر کا مفصل ذکر آ چکا ہے ۔ یہاں صرف اس قدر اعادہ جائز ہوگا کہ یہ ضلع دلی اور پنجاب اور یو ۔ پی میں میرٹھ ۔ بدایوں مرادآباد اور علی گڑھ کے اضلاع سے متصل ہے ، دلی ۔ میرٹھ اور علی گڑھ بلند شہر خاص سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہیں ۔ شائستہ طبقہ کی زبان دلی سے متاثر ہے ۔ دلی اور میرٹھ کے قرب و جوار کا یہ خطہ دراصل اردو کا گہوارہ ہے ۔ اس لئے یہاں کے قصبات کی زبان بہت صاف ہے ۔ شہر کا ابتدائی نام برن ہے ۔ جو مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کی وجہ سے متعارف ہو چکا ہے ۔

بلند شہر ۔ خورجہ ۔ سکندر آباد ۔ گلاؤٹھی ۔ جیور اور جہانگیر آباد ضلع کے ۱۷ قصبات میں سے ان چھ قصبوں میں شعر و شاعری کا چرچا رہا ہے اور اب بھی پایا جاتا ہے ۔ ڈبائی کو بھی شمار کر لیجئے تو سات ہو جاتے ہیں ۔

جیور کے بیشتر شعراء بہ سلسلۂ معاش گوالیار میں سکونت پذیر ہوئے اور وہاں دھوم مچا دی ۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب راجے مہاراجے اردو شعرا کی سرپرستی کرتے تھے حضرات جیور میں سے اکثر کو نوح ناروی (شاگرد داغ) سے تلمذ ہے ۔ اور بعض حضرات نے اس رنگ میں خوب کہا ہے ۔ جہانگیر آباد میں شگفتہ اور رشکی کے بعد کوئی اچھا کہنے والا نظر نہیں آتا ۔ خورجہ میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں مگر خاموش ہیں ۔

مولینا عبد الرحمٰن خاں فیروز مرحوم کے یہاں داغ مرحوم کے طویل قیام کا ذکر صحبتوں میں اب بھی آجاتا ہے۔

سکندرآباد کے کایستھ خاندانوں میں ابھی تک یہ ذوق باقی ہے۔ اس بحر کے ناخدا بھی نوح ہیں۔ گلاؤٹھی کے بیشتر شعرا بھی رسا کے سلسلہ سے داغ سے وابستہ ہیں۔ ڈبائی اور بلند شہر نسبتاً آزاد نظر آتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ محفل داغ سے متاثر ہے، اس اثر کے نقوش زبان کی سلاست میں ملیں گے۔

مجھے آخر میں نمائش کمیٹی بلند شہر اور نواب مکرّم علی خاں صاحب مکرّم رئیس پہاسو و جاگیردار بے پور کا شکریہ ادا کرنا ہے، کہ اس کتاب کی طباعت میں معاون ہوئے۔ اپنے رفیق کار خضر صاحب کا ممنون ہوں جو شعرا اور ان کے کلام کی جستجو میں واقعی خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ پیامی صاحب نے کتابت کے سلسلہ میں اور اقبال صاحب نے انتظامی امور میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ نشتر سکندرآبادی۔ مشوخ برنی۔ رحمت برنی۔ مضطر گلاوٹھوی۔ تاسف خورجوی۔ اثر سکندرآبادی۔ ریاض جیوری۔ عبد اللہ خاں خوشگی جمشید علی خاں صاحب وغیرہم نے کلام کی فراہمی میں میری بڑی مدد کی۔ شکوہ کی داستان شکریہ کی روداد سے زیادہ طویل ہے۔ اگر یہ داستان مختصر ہوتی تو یہ کتاب کبھی کی چھپ چکی ہوتی اور حسب دلخواہ۔ اس وقت میں صرف شیفتہ اور تفتہ کے اخلاف کے عدم اعتنا کی طرف اشارہ کروں گا۔ شعرائے کرام جنھوں نے کلام کا انتخاب یا انتخاب کی اجازت مرحمت کی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور شعرائے بلند شہر کا یہ احسان کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنی محفل خاص میں مجھ غریب الدیار کو جگہ دی۔ حالانکہ میں ان کی غزلوں کو بیدردی کے ساتھ ذبح کر چکا تھا۔ کاش وہ یہی بتاؤ میرے سبک

اشعار کے ساتھ روا رکھتے ہے

ان سب سے الگ میں خواجہ صاحب (خواجہ سعید الدین احمد صاحب) کی خدمت میں مؤدبانہ ہدیۂ امتنان پیش کرتا ہوں۔ جن کی پاکیزہ اور معصوم سرشت ہر درخشاں شعر سے زیادہ تابناک ہے۔ اور جن کی توجہ کا ایک ادنیٰ کرشمہ اس کتاب کی تکمیل ہے

دلیوریا
۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء

سید حامد

ریاض :-

محمد ریاض الدین نام۔ ریاض تخلص وطن جیور ہے۔ قاضی صاحبان جیور کا سلسلہ خواجہ عبداللہ انصاری کے توسّل سے حضرت ابو ایوب انصاری رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے آپ ۱۸۹۸ء میں جیور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گوالیار میں پائی۔ اور عربی، فارسی اور ہندی میں خاصی دستگاہ حاصل کر لی۔ اسناد علی گڈھ سے حاصل کیں۔ دو مضامین میں ایم اے کیا غیر معمولی حافظہ پایا ہے۔ بقول خود ان کے "دس گیارہ" سال کی عمر میں ایک ہندو معلم کی غیرت دلانے پر پانچ ہزار تک پہاڑے یاد کر ڈالے۔ جو باوجود تین جگ بیت جانے کے آج تک یاد ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہوئے۔ پانچ چھ سال بعد اصلاح لینے کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ استاد کے رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ سادگی۔ محاورہ بندی۔ ان کے کلام کے عناصر ترکیبی بندشیں چست ہیں۔ اسلوب پختہ گوئی کا مظہر اور کہنہ مشقی کا غماز۔ محبوب سے لکھنوی انداز میں طالب اور معاملہ بندی یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔

دمِ آخر کسی کی حسرتِ دیدار میں کھل کر
خدا جانے مریضِ غم کی آنکھیں کہہ گئیں کیا کیا

نہیں ممکن کہ نہ یاد آئیں وفائیں میری
اب نہیں چار گھڑی بعد پشیماں ہونا

گو ضبطِ عشق، عشق میں لازم ہزار تھا
کب اختیار میں دلِ بے اختیار تھا

اصطلاحِ عشق میں اب موت کہتے ہیں جسے
پہلے عرفِ عام میں اس کا محبت نام تھا

قابلِ عبرت ہے دورِ عشق کا یہ انقلاب
شوقِ آغازِ جوانی، موت انجامِ شباب

کہیں ایسا نہ ہو مجھ پر انھیں رحم آ جائے
ہاں مدد کر میری اے طالعِ ناساز کچھ اور

تجھے خبر بھی ہے اس کی کہ اک نظر نے تری
وہ کہہ دیا جو مجھے آج تک نہ تھا معلوم

جو میں بُرا کبھی کہتا ہوں اپنی قسمت کو ـــــ خبر نہیں تمہیں ہوتا ہے کیوں بُرا معلوم
نہیں ہے زینتِ پہلو کا مستحق ہرگز ـــــ وہ دل جو تیری محبت کا پردہ دار نہیں
بڑا سکون ہے اس دل کو جو محبت میں ـــــ تری نگاہِ کرم کا امیدوار نہیں
تری الفت میں یہ ہے حالتِ رشک ـــــ زمانہ کی نظر ہے اور میں ہوں
حیراں ہوں کہ عشق میں آخر قصوروار ـــــ ٹھہراؤں اپنے دل کو کہ انکی نظر کو میں
ہو گئی اس سے بڑھ کے اور وسعتِ طولِ سحر کیا
حشر کئی گزر گئے میری شبِ دراز میں

الٰہی آشیاں جلنے سے پہلے موت آجائے
مری آنکھوں کے آگے میری محنت رائیگاں کیوں ہو

کسی کو دیکھ لیا آج میری نظروں نے ـــــ کہیں نہ آپ ہی اپنی مجھے نظر ہو جائے
یہ کہتا ہے نہ اٹھنا مجھ سے ان نیچی نگاہوں کا ـــــ دل آسانی سے ملتا ہے نظر مشکل سے ملتی ہے
خدا کے لئے یوں شبِ ماہ میں تم نہ نکلا کرو گھر سے باہر اکیلے
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے کہیں چاند رُخ کی بلائیں نہ لے لے
کیا کروں اسکی محبت نہیں جاتی دل سے ـــــ اب وہ ظالم سہی قاتل سہی کیسا ہی سہی

شوخ

عبدالقدیر نام شوخ تخلص ۱۸۹۵ء میں بلند شہر کے ایک قدیم و شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ حلیم المتواضع منکسر المزاج اور مرنجان مرنج۔ نہ انھیں کلام سنانے کا شوق اور نہ تنقیص کرنے کا شعراء کے روایتی عیوب سے محفوظ ہیں۔ بلند شہر خاص کے شعرا کے امام ہیں اور ضلع کے اساتذۂ اربعہ میں شمار ہوتے زندگی کی چالیس بہاریں اور بارہ خزائیں دیکھ چکے ہیں تاہم ان کا گلستان سخن ہنوز مرقع بہار ہے اشعار کاوش سے کہتے ہیں، غزل میں درد ہے اور نظموں میں فکر۔ زندگی عسرت مگر قناعت میں گذر رہی ہے۔ کچہری میں کام کر رہے ہیں۔ بصارت کو زوال ہے، اور بصیرت کو فروغ، چھریرا بدن ہے اور کشیدہ قامت داڑھی رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ بغیر محسوس کئے ہوئے نہیں کہتے، ان کے اشعار خام محسوسات کا مرقع نہیں ہیں، وہ محسوسات پر فکر کے جھروکے سے نظر کرتے ہیں۔

مری خستہ حالی ہے ماتم جہاں کا — زیارت کدہ ہوں غم رفتگاں کا
نفس در نفس ہوں عزادارِ ہستی — جنازہ ہے کاندھے پہ عمر رواں کا

دل لگا کر خراب ہونا تھا — یہ بھی اک انقلاب ہونا تھا
گریۂ بے کیف ہے محبت میں — آنسوؤں کو شراب ہونا تھا
رازِ غم کھل گیا زمانے پر — درد بے اضطراب ہونا تھا

دل کی بربادیٔ پیہم کے ہیں افسانے چند — ایک دیوانہ سے آباد ہیں ویرانے چند

دل کا ہر داغ ہے آسودۂ تصویرِ جمال
شوخ یہ بھی ہیں مری منزلِ رفتہ کے نقوش
ایک شیشہ میں اُتارے ہیں پریخانے چند
نظر آتے ہیں ستاروں میں جو کاشانے چند

گرم نوائے شوق ہے کون رگِ حیات پر
کیوں ہیں کلیم و طور تک حسن کی راز داریاں
دل میں وہ سوزِ غم نہیں روح میں وہ تڑپ نہیں
روزِ ازل جب آہ کو ضبط کیا تھا عشق نے
نغمۂ جانگداز سے سحر ہے کائنات پر
پردہ اٹھا کے آ ابھی جا بامِ تعینات پر
کوئی تو برقِ نو گرا کارگہِ حیات پر
چھائی ہوئی ہے آج وہ دامنِ شش جہات پر

غم سے بدتر ہے خوشی تیرے بغیر
ڈوبتی جاتی ہے نبضِ کائنات
چاند کے دل سے بھی اُٹھتا ہے دھواں
کچھ دل ہیں ناواقفِ آدابِ عشق
حال ہے ناگفتنی تیرے بغیر
جاں بلب ہے زندگی تیرے بغیر
ہر قضا ہے ماتمی تیرے بغیر
یہ ہنسی ہے کافری تیرے بغیر

ایسے بھی کچھ مقام ہیں فکر و نظر سے دور
نظارہ روبرو ہے تجلّی نظر سے دور
دل مبتلا سے دور نگاہیں خبر سے دور
جس رہگذر سے پاس اُسی رہگذر سے دور
اک نقشِ رہگذر ہوں مگر رہگذر سے دور
ہستی قضا کو ڈھونڈھ رہی ہے قدر سے دور

اُٹھتے جاتے ہیں پردہ ہائے مجاز
دل سے کچھ کہہ کے وہ چلے بھی گئے
اے غمِ دوست تیری عمر دراز
عشق اب تک ہے گوش بر آواز

اب تری یاد بھی نہیں آتی — بھول جانے کا ہے یہ کیا انداز
ہر قدم پر رہِ محبت میں — اک نئی زندگی کا ہے آغاز
شوخ ایسا بھی ایک سجدہ کر — جھک کے اٹھے نہ پھر جبینِ نیاز

بہارِ گریۂ شبنم پہ مسکراتی ہے — گلوں کو رازِ غمِ جاوداں نہیں معلوم
ہونے لگی ہیں حسن کے پردوں کی جنبشیں — جی چاہتا ہے اور بڑھاؤں نظر کو میں
یہ ماتمِ حیات سہی یا غمِ وفا — پہچانتا ہوں گریۂ شمعِ سحر کو میں

رہینِ غم ہوں نہ آسودۂ خوشی ہوں میں — تری رضا میں جو گذرے وہ زندگی ہوں میں
فروغ پاتی ہیں عالم کی ظلمتیں مجھ سے — عجیب شمعِ حوادث کی روشنی ہوں میں
تلاش کر مرے قدموں میں راحتِ ابدی — جو ماورائے فنا ہے وہ زندگی ہوں میں
ہوئی ہے مجھ سے غمِ کائنات کی تخلیق — ازل سے تا بہ ابد دردِ باقی ہوں میں
برنگِ شمعِ سحر شعلۂ داغِ ہستی ہوں — بقیدِ زیست سراپائے جانکنی ہوں میں

دونوں عالم دور ہٹ جاتے ہیں شوق سے — آج ان کے واسطے آغوش پھیلاتا ہوں میں
جذب ہوتا جا رہا ہوں جلوۂ آواز میں — اب انھیں ہر سانس میں نغمہ سرا پاتا ہوں میں
شوخ گذرا ہے ادھر سے کاروانِ حسن دوست — نقش کچھ منزل بہ منزل دیکھتا جاتا ہوں میں

محبت کا سبق دہرا رہا ہوں — دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

تمہارے غم سے دل بہلا رہا ہوں
جنوں کی گتھیاں سلجھا رہا ہوں

ادھر بھی اک پیکانِ محبت
خلش میں کچھ کمی سی پا رہا ہوں

ترے قربان اے سوزِ محبت
سراپا خاک ہوتا جا رہا ہوں

محفلِ ہست و بود میں آئینہ خودی نہ دیکھ
مقصدِ زندگی سمجھ پیکرِ زندگی نہ دیکھ

عالمِ دید ہی میں جھلک اپنی نگاہ کی نہ دیکھ
پردۂ روشنی اٹھا پرتوِ روشنی نہ دیکھ

ایک ہی سجدہ میں سمجھ رازِ پرستش و جبیں
نقشِ سرِ نیاز میں حاصلِ بندگی نہ دیکھ

حسرتِ دید باز کو غرقِ تجلیات کر
منزلِ طور سے گذر حیرتِ موسوی نہ دیکھ

موت کا نام بھی جہاں زندگیِ دوام ہے
ایسی بقا تلاش کر خضر کی زندگی نہ دیکھ

شوخِ قیودِ جبر سے روح کو بے نیاز کر
لطفِ فروتنی اٹھا شورشِ خودسری نہ دیکھ

تسلی بخشِ جانِ عشق ہیں بیتابیاں میری
ترے جلووں کا افسانہ ہے عمرِ جاوداں میری

قیامت خیز ہے شوخِ حزیں تقدیر کا منظر
سرِ منزل ہوئی ہے سعیِ حاصل رائیگاں میری

جنوں میں ضبط کی جاگیر بھی برباد ہوتی ہے
لبِ خاموش کی تصویر بھی فریاد ہوتی ہے

وہی پردہ اٹھا نظارہ ہے زنداں میں تصور کی
نظر زنجیر در زنجیر بھی آزاد ہوتی ہے

مجھی کو سونپتے ہیں حسن کے اسرار سربستہ
مجھی سے عشق کی تفسیر بھی ارشاد ہوتی ہے

لبِ ہر موج سے اٹھتا ہے طوفانِ فغاں اکثر
غمِ شیریں میں جوئے شیر بھی فرہاد ہوتی ہے

حیاتِ عشق لذت کوش ہے غم ہائے تازہ کی
بنیادِ دل بھی نئی تقدیر بھی ایجاد ہوتی ہے

جفا جو کی نگاہِ مہر سے بھی دل لرزتا ہے　　کفِ جلاد میں شمشیر بھی جلاد ہوتی ہے

بربادیٔ دل کی منزل تک ہر گام پہ پتھر پایا ہے　　انجامِ محبت کچھ بھی ہو آغاز تو بہتر پایا ہے
فطرت کا جمالِ نیرنگیٔ ہستی کو مٹا کر پایا ہے　　جو راز گلوں پر کھل نہ سکا کانٹوں کی زباں پر پایا ہے
بیتابِ نظارہ آنکھوں سے کیفیتِ غم بھی چھپ نہ سکی　　ہر اشک کو نوکِ مژگاں پر اک سوختہ گوہر پایا ہے
شاید ہی کوئی دیوانہ مقصود کی حد تک پہنچا ہے　　اس راہ کو جس نے دیکھا ہے بے منزل و رہبر پایا ہے
اے شوخ جنونِ فرقت کو دیوانہ راحت کیا جانے　　تپتی ہوئی غم کی راتوں سے کچھ ایسا ہی منظر پایا ہے

دلِ دیوانہ میں بھر کر گدازِ عاشقی ہم نے　　انا الحق کی لبِ منصور سے آواز دی ہم نے
سکوں کو درد سمجھا رنج کو جانا خوشی ہم نے　　فسردہ زندگی میں روح پھونکی ہر نئی ہم نے
تمنا کو سمجھ کر اک فریبِ دائمی ہم نے　　غمِ محبوب پہ قربان کر دی ہر خوشی ہم نے
حقیقت میں جنونِ بیخودی خضرِ حقیقت ہے　　بہت کھائے ہیں منزل تک فریبِ آگہی ہم نے

تاسف

مولوی ناصر علی صاحب تاسف خورجوی۔ خورجہ کے ایک شریف خاندان کے فرد ہیں۔ سفید فام قد میانہ سے کچھ کم۔ بھرا ہوا جسم، چہرہ اور جبیں پر عمر کی لکیریں۔ خدوخال پر وضعداری کی مہر لگی ہوئی۔ نشست و برخاست اور گفتار و اطوار میں تعلیق۔ وضع قطع حضرات لکھنؤ کی سی۔ گفتگو میں صحت و شوکتِ زبان کا التزام رکھتے ہیں۔ ہر بات کو سلجھا کر بیان کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ شعبۂ تعلیم میں زندگی بسر ہو رہی ہے۔ خورجہ کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی ہیں

ہیں نظم لوگوں کو اتنا اچھا تحت اللفظ پڑھتے سنا ہی۔ آواز میں جان ہے۔ درد و گداز پیدا کر لیتے ہیں مراثی خوب پڑھتے ہیں۔ غزلوں میں زبان کی صفائی اور سادگی کا التزام ہی۔ لطفِ زبان ہی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہی، باطل شعر میں التزام بالالزام برتتے ہیں یعنی بعض مضامین کو ان کے کلام میں کہیں نہ پائیے گا۔ مثلاً رقابت کا مضمون یا زاہد پر تعریض کلام میں پختگی ہی، موضوعی نظمیں کہتے ہیں۔ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ زبان کی لطافت میں خیال کی ندرت نمو تی ہوئی ہے۔

طلسمِ آب لو ٹرے روحِ مجرّد قیدِ امکاں کا — کہ نظارہ مجھے منظور ہے عالمِ جاں کا

ہوئی گم خامشی یوں غربت میں شمعِ زندگی میری — چراغِ نیمجاں جیسے بجھے گورِ غریباں کا

اللہ اللہ سعیِ ناکامی اثر کی برکتیں — میں بڑھا دو ہاتھ کوسوں دور ساحل ہو گیا

تیر تھا جب تک کہ چٹکی میں تمھاری تیر تھا — آ گیا جب میرے پہلو میں رگِ دل ہو گیا

طے کر لیے تری تصور کی منزلیں — لاکھوں حجاب ہیں کوئی حائل نہیں رہا

آگے بڑھا ہے نظارۂ خموش — گویا ہوا تو دورِ غمِ محفل نہیں رہا

میں اس مقام پر ہوں تاسفِ جہاں مجھے — کچھ امتیازِ جادہ و منزل نہیں رہا

دردِ دل سے جو آشنا نہ ہوا — اس کا ہونا ہی کیا ہوا نہ ہوا

تلخیِ مرگ خوش گوار رہی — میں ترے ہوتے بےمزا نہ ہوا

سرو ساماں سے کیا فقیروں کو — بوریا بھی ہوا ہوا نہ ہوا

درد میں دکھ میں شبِ فرقت بسر ہو جائیگی — زندگی ہے تو بہر صورت سحر ہو جائیگی

تم نہ آؤ گے تو کب شغلِ تصوّر بھی گیا
بند آنکھیں کر کے جب کھولیں سحر ہو جائے گی

آج حالت ہے بہت نازک ترے بیمار کی
ہونے والی بات کی کل تک خبر ہو جائے گی

سہل کیا سمجھا ہے زاہد تو نمازِ عشق کو
یہ ادا ہوتی ہے سر سے دامنِ شمشیر پر

سکھا کر والہانہ زندگانی کا چلن مجھ کو
محبت نے کیا ہے بے نیازِ ما و من مجھ کو

مصیبت میں یہ سچ ہے کام کچھ اپنا ہی آتا ہے
چراغِ شامِ غربت بن گیا داغِ وطن مجھ کو

ادائے حسن نے کیا کیا نظر کی ہنگامہ آرائی
صدائے دل نشیں بن کر نگاہ برق زا ہو کر

چمن کی یاد وہ بھی زندگی میں چھوڑ دے بلبل
بدن سے روح بھی نکلے گی پھولوں کی ہوا ہو کر

ملا کوئی نہ اہلِ درد اپنی ہمنوائی کو
رہے ہم پردۂ ہستی میں سازِ بے صدا ہو کر

الفت کا راز لاکھ چھپایا نہ چھپ سکا
حرفوں سے لفظ لفظ سے افسانہ ہو گیا

زنداں میں جب سے ہیں ترے وحشی لے جان وی
ہر کا مقام بن گیا ویرانہ ہو گیا

دنیا کی آنکھ پھر گئی تیری نظر کے ساتھ
اب جس کو دیکھتا ہوں وہ بیگانہ ہو گیا

ہر لحظہ جام و دل کے چھلکنے کا خوف ہے
لبریز حسرتوں سے یہ پیمانہ ہو گیا

عالمِ وحشت میں جو باتیں زباں پر آ گئیں
شرحِ ہستی بن گئیں تفسیرِ عرفاں ہو گئیں

اے معاذ اللہ میرے گریۂ حسرت کا جوش
جتنی آنکھوں کی رگیں تھیں موجِ طوفاں ہو گئیں

لحد بنی ہے ہماری ہوا کے رستے میں
کبھی کسی کے جلائے چراغ جل نہ سکا
نقاب چہرہ سے اٹھ کر کسی کے گر بھی گئی
ادھر نگاہ کا پہلو بھی میں بدل نہ سکا
لطف نہیں کرم نہیں مہر نہیں وفا نہیں
ناز کی اک نگہ سے بھی آنکھ کوئی چرائے کیوں

میں کیا کہوں کہ جو بری حالت قفس میں ہے
بجلی کی چشمکیں سر گلزار دیکھ کر
کچھ تو کلیم طور کی باتیں سنائیے
آئے ہیں آپ جلوۂ دیدار دیکھ کر
بیمار کو جو دیکھنا ہو آج دیکھ لو
کل ہو گئے نوحہ گر در و دیوار دیکھ کر

گلہ ہو رہا نہیں، شکوۂ بیداد نہیں
پیکر درد ہوں لیکن لب فریاد نہیں
مختصر ہے یہی افسانۂ ایام شباب
خواب تو اک نظر آیا تھا مگر یاد نہیں
آج گردش میں ہیں بالائے قفس کچھ تنکے
نشیمن ہی تو میرا کہیں صیاد نہیں

ہم سے دیوانے کہیں ہوتے ہیں پابند بہار
اُن کے جب گیسو کھلے بیابان وحشت ہو گئے
رنگ نالوں ہی ٹپکتا ہے ہر اک تصویر سے
آرزو کے سب مرقع نقش حسرت ہو گئے
جب سفر میں یاد آئے ہم کو احباب وطن
آبلے دل کے چراغ شام غربت ہو گئے

سر حشر ہوتی ہے اب روبکاری نہیں دیکھی جاتی تری شرمساری
مرے سر جھکا لینے والے بتا دے یہ کہہ دوں کہ یہ میرا قاتل نہیں ہے

نہیں اس سے انکار ہوگا جہاں میں، کبھی قیس و فرہاد کا بھی زمانہ
محبت کی دنیا میں ہے آج کل تو، ہماری کہانی ہمارا فسانہ

کہوں تجھ سے کیا اپنی روداد ہمدم کہ میں تو ہوں اک انقلاب مجسم
مٹیں زندگانی کی ساری بہاریں چمن لٹ گیا چھٹ گیا آشیانہ

عناصر کا بکھرا ہوا ساز ہیں ہم شکستہ ہے سر تا بہ آواز ہیں ہم
نہیں ہچکیاں یہ رباب زندگی کا ہے اکھڑا ہوا آخری اک ترانہ

شہید وفا آج دولہا بنا ہے ذرا اک نظر آ کے اب تم بھی تو دیکھو
لہو کی ہیں دھاریں کہ سہرے کی لڑیاں کفن ہو کہ پہنے ہی جوڑا شہانہ

کسی کی جوانی کا عالم نہ پوچھو سراپا ہے تصویر رعنائیوں کی
صدائیں ترنم لبوں پہ تبسم نظر ساحرانہ ادا کافرانہ

سنی ہے طور و موسیٰ کی کہانی — یہاں کس کو دماغ لن ترانی
لسان اللہ ہے تو یا محمد — کلام اللہ ہے تیری زبانی
تری زلفیں سواد عالم جاں — ترا چہرہ بیاض زندگانی
یہ ہے تار رگ جاں کی تمنا — کہ ہو پیوستۂ برد یمانی

رسول اللہ کے روضہ پہ جا کر — صبا کہنا تاسف کی زبانی
غریق بحر عصیاں کی خبر لو — کہ اب سر سے بہت اونچا ہے پانی

طوقِ آہنگر کبھی گردن سے اترا ہمنفس — بن گیا قفلِ درِ زنداں مری تقدیر سے
دیکھتا ہے جھک کے او ناوک فگن کیا بار بار — دل کے کچھ ٹکڑے لپٹ آئے ہیں نوکِ تیر سے

بےخبر منزلِ ہستی کا تماشا کیسا — چھاؤنی اس کو سمجھ اک، وطن آواروں کی
ڈوب کر نبضیں ابھرتی نہیں دو دو ساعت — اب یہ حالت ہے مسیحا ترے بیماروں کی
بند یوں کرتا ہے اب چاک قفس بھی صیاد — کہ ہوا آتی ہے اس راہ سے گلزاروں کی
کیا اثر کر گئی رگ رگ میں تری برقِ جمال — آج تک جنبشیں جاتی نہیں کہساروں کی
درد پیدا ہے نگاہوں سے تاسف دل کا — آیتیں ہیں یہ مرے قلب کے سیپاروں کی

فنا فی العشق ہو جانا وصالِ جاودانی ہے — کہ جل کر شمع کی آغوش میں پروانہ رہتا ہے

تجھے کر دیا عالمِ بیخودی میں بڑے سنگ دل بیوفا کے حوالے
نگہبانِ عالم نگہبان تیرا ارے میرے دل میرے نازوں کے پالے
کہوں کیا جو حالت ہے سوزِ نہاں کی کوئی حد بھی آخر ہے ضبطِ فغاں کی
دہکتا ہے پہلو سلگتا ہے سینہ پھپھولے کلیجے میں ہیں دل میں چھالے
مریضِ محبت کی ہو خیر یا رب کہ آثار کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں
کئی ایسی خاموش گزری ہیں راتیں نہ اگلے کو آہیں نہ پچھلے کو نالے

وہ جانتی تھی اپنا رفیقِ سفر مجھے — کیوں رو دئیے زار زار نہ شمعِ سحر مجھے
عکسِ جمالِ دوست ہے یا خود جمالِ دوست — یہ امتیاز کر کے بتا اے نظر مجھے

مضمر ہے اضطراب میں رازِ حیاتِ دل
کرتا ہے کیوں ہلاک مرا چارہ گر مجھے

گستاخیاں معاف مری اے وفائے حسن
جلووں نے کر دیا ہے پریشاں نظر مجھے

اے نشترِ نگاہ ذرا چشمِ التفات
پھر ہے خیالِ مرہمِ زخمِ جگر مجھے

جلووں سے کامیاب کبھی فرمائے گا وہی
جس نے عطا کیا ہے مذاقِ نظر مجھے

یارب شبِ فراق مری پردہ پوش ہو
دیکھوں نہ میں سحر کو نہ دیکھے سحر مجھے

قابل گلاوٹھوی

منشی رحیم اللہ نام قابل تخلص مولینا فدا گلاوٹھوی کے شاگرد رشید اور داماد ہیں صحافت کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں۔ اور علوم مشرقی میں دخل، عروض کے ماہر ہیں اور زبان پر ایک حد تک قادر، غزلیں عموماً طویل ہیں اور فکر کی غماز۔ تقریر خوب کرتے ہیں، روزمرہ کی گفتگو میں بھی الفاظ کا انتخاب ان کی صحیح قرأت اور ان کی نشست کا خیال رکھتے ہیں، اشعار کہنہ مشقی کا ثبوت ہیں، سنگلاخ زمینوں کو برتتے ہیں صحافتی اور ادبی مشاغل نے بلند شہر چھڑوا دیا ہے، ایک عرصہ سے دلی میں سکونت اختیار کر رکھی ہے۔ قابل صاحب کا رنگ سانولا ہے۔ عمر کوئی چالیس ۴۰ کے قریب ہوگی، وضعدار اور خوش مزاج انسان ہیں۔

مطمئن ہیں بازگشتِ حسرتِ بسمل سے ہم
روحِ محفل کھینچ لائے ہیں تری محفل سے ہم

ماورا ہیں امتیازاتِ حق و باطل سے ہم
قصدِ منزل کر رہے ہیں آخری منزل سے ہم

یہ یقیں رکھتے ہیں اپنے جذبۂ کامل سے ہم
جانِ محفل بن کے نکلیں گے تری محفل سے ہم

کس قدر مانوس ہیں سفاکیٔ قاتل سے ہم
وجد میں آتے ہیں آوازِ شکستِ دل سے ہم

پڑھ چکے ہیں اپنی اک اک آرزو پر فاتحہ
دل کی میت لے کے اٹھے ہیں تری محفل سے ہم

زندگی میں کیا ملیگا قلبِ مضطر کا جواب
دلکشی اس کی ادا دامن کشی اس کا چلن
ہی ناکامی پہ شاکر رہ کے مسرور جاننے کا کام
آخری ہچکی ہے قابل شرحِ اسبابِ حیات

شامِ غم اپنی جگہ ہے صبحِ محشر کا جواب
خار بھی گلشن سے باہر ہے گلِ تر کا جواب
صبر مجبوری ہے ہر بگڑے مقدر کا جواب
اک نفس میں پل رہا ہے زندگی بھر کا جواب

گردش ہے کچھ زمیں کی کچھ آسماں کا رنگ
اللہ ایسے سجدے کی توفیق دے ہمیں
تاثیرِ عشق ہی کا کرم ہے یہ حالِ زار

ہے تیری اک نگاہ میں دونوں جہاں کا رنگ
ہر آستاں میں آ گئے تیرے آستاں کا رنگ
چہرے کا رنگ اڑے تو سمجھے فغاں کا رنگ

گم ہم رہے حباب کی طرح جسم نہ ان کا رنگ
کھل مل گئے تو حسرتِ دیدار رہ گئی
ہر پھول ہے بہار کے غم میں خزاں بدوش

خود کارواں کیا ٹھہر رواں ہے غبار رنگ
ہے لطفِ عاشقی خلشِ انتظار رنگ
کیا جانیے کہ رنگِ چمن کیا بہار رنگ

کتنا خود رفتہ ہے تیری یاد کی چاہت میں دل
ہو گیا ہے ناز و غمزہ ہر صورت میں دل
اک نگہ کے تصور سے ہے کس راحت میں دل
پھول ہو شانہ ہو آئینہ ہو یا ہو شمعِ بزم
اے نگاہِ ناز تیری دلنوازی کے نثار
دل کی ہر دھڑکن ہے قابل اک پیغامِ ازل

میری آنکھوں تک کھنچ آیا اشک کی صورت میں دل
دل کی قسمت میں ہے الفت حسن کی قسمت میں دل
دل ہے جنت ہے خدا جانے کہ ہے جنت میں دل
رہتا ہے پیشِ نگاہِ دوست ہر صورت میں دل
مست رہا ہے ناوکِ دل دوز کی حسرت میں دل
یاد کرتا ہے وطن کو عالمِ غربت میں دل

عبرت بھری ہے حسن کی محفل کی داستاں / آنکھوں سے کان ہوں تو سنیں دل کی داستاں
اب مجھ سے ضبطِ رازِ محبت محال ہے / ہر سانس کہہ رہا ہے مرے دل کی داستاں
اس شمع سے ہے عشق کی محفل میں روشنی / یہ داغِ دل ہے اک مہِ کامل کی داستاں

جو تیرا وعدۂ فردا ہی سازگار نہ ہو / حیات کیا ہے فنا کا بھی اعتبار نہ ہو
فنا سے عشق کہیں عمرِ مستعار نہ ہو / یہ داغِ دل ہی چراغِ سرِ مزار نہ ہو
خطا کرم کا تقاضا ہے بندگی کا نشاں / بشر خطاؤں سے بچ کر گناہگار نہ ہو

دیوانہ سمجھے دیکھ بہار و خزاں کا فرق / دشت و چمن میں ہے قفس و آشیاں کا فرق
اس سجدہ کی طلب میں ازل سے ہوں سجدہ ریز / وہ سجدہ جو مٹائے سر و آستاں کا فرق
ہو موت اگر حقیقتِ ہستی کی پردہ در / مٹ جائے ایک سانس میں تو جسم و جاں کا فرق
وہ دن گئے کہ سجدہ درِ شاہ سیج پہ / جھکتا ہے آپ شعور سر اس آستاں کا فرق
ہو سلسلہ ازل سے ابد تک حیات کا / قائل ملے گا حشر میں عمرِ رواں کا فرق

رحمت

محمد رحمت اللہ نام رحمت تخلص ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۰۵ھ ہجری بروز جمعۃ الوداع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد بزرگوار کا نام محمد عبد اللہ ہے۔ امامت کے منصب پر فائز ہیں۔ وضع قطع اور اوقات و اوراد میں متشرع۔ داڑھی میں سرخ خضاب کرتے ہیں زاہد ہیں مگر خشونت نہیں خوش مزاج اور بہت کچھ بزرگ ہیں۔ غزلیں عموماً طویل ہوتی ہیں، اشعار میں اکثر معاملہ بندی بلکہ

زبان پر توجہ ہے۔ سادہ زبان روزمرہ اور رعایتِ لفظ کا التزام رکھتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں یہ مہارت ہے کہ بات بات میں تاریخ نکال لیتے ہیں۔ حضرت ریاض خیرآبادی کے شاگرد ہیں۔

زمانہ جلوۂ جاناں سے فیضیاب ہوا
فروغِ حسن سے ہر ذرّہ آفتاب ہوا

اُدھر نقاب اٹھی بند اِدھر ہوئی آنکھیں
وہ بے حجاب بھی ہو کر نہ بے حجاب ہوا

رہا نہ آئینہ اب دیکھنے کا شوق انھیں
جب آئینہ پہ نظر کی وہی جواب ہوا

چھوٹ گیا ہاتھ سے یہ گوشۂ داماں کس کا
صبح سے پہلے ہوا چاک گریباں کس کا

بڑھ گئی ہے جو درازی تیری اے شبِ غم
اس قدر خون پیا ہے شبِ ہجراں کس کا

مرے پہلو میں دلِ قاتل کے پیکاں سے الجھ بیٹھا
یہ صاحب خانہ اپنے گھر میں مہماں سے الجھ بیٹھا

پڑا ہوں دشتِ وحشت میں نحیف و ناتواں ہو کر
میں کانٹا بن کے دامانِ بیاباں سے الجھ بیٹھا

زلیخا کا گریبانِ محبت ہو گیا ٹکڑے
جو دستِ آرزو یوسفؑ کے داماں سے الجھ بیٹھا

ہم قضا کی نیند سوئے جب سنی اس نے خبر
اور کیا کرتے تغافل تھا تغافل کا جواب

عقدہ یہ سمجھے کہ ہے موجبِ دلبستگی
ہے سیہ بختی ہماری اُن کی کاکل کا جواب

اک زباں سے پوچھ تو تشریح دردِ چشم زار
جزو گو کہنے کو ہے دیگی مگر کل کا جواب

عشق نے نیچا دکھایا بڑھ کے رحمت آئے دن
بن نہ آیا اس ترقی و تنزل کا جواب

جب کلاہ زر کو سر پر تو نے پہنا سیمتن
میں یہ سمجھا ہے مہ انور کے اوپر آفتاب

مجھ پہ میرا ساقیٔ مہوش ہی ایسا مہرباں
روز و شب مہتاب میں دیتا ہی بھر کر آفتاب

روز و شب کے بے سبب جلنے سے رحمت کھل گیا
ہے ستارہ بخت کا اپنے مقرر آفتاب

صاف دونوں ہیں اگر اب دیکھئے اہل نظر
دیکھتے ہیں آئینہ یا دیکھتے ہیں روئے دوست

رہنمائی شوق کی کافی ہے وقت جستجو
دل مچل جائیگا فوراً آئیگا جب کوئے دوست

ایک قاتل ہو مرا رحمت تو اوسکا نام لوں
بانکپن ہے ترچھی نظریں ہیں خم ابروئے دوست

شمشیر نظر قاتل ہی تو ہے
دل کیوں نہ ہو بسمل دل ہی تو ہے

کیوں ہاتھ رکے قاتل ہی تو ہے
کیوں سر نہ جھکے بسمل ہی تو ہے

جھڑکو نہ اسے اپنے در پر
مانو نہ برا سائل ہی تو ہے

کیوں آ کے نہ ٹھہریں دل میں مرے
تیروں کی ترے منزل ہی تو ہے

رحمت کا جگر اب دیکھ لیا
ہیں سینکڑوں غم اک دل ہی تو ہے

غضب کی بات ہے جنکے بتوں پر دم نکلتے ہیں
انھیں پر تیغ اوٹھتی ہے انھیں پہ ہاتھ چلتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ پروانوں سے جلنا سیکھ لے کوئی
محبت جنکو ہے وہ آگ میں اس طرح جلتے ہیں

ہمیں تم قتل کر دو دیکھنا پھر سینکڑوں عاشق
قلم ہوتی ہیں جب شاخیں تو پھل اور پھلتے ہیں

ادا کے ناز کے ابرو کے چشم کے قاتل کے
نثار ہونے کو ٹکڑے ہوئے مرے دل کے
تڑپ کے چوم لیے ہاتھ اپنے قاتل کے
یہ حوصلے تو شہیدی ہیں بسمل کے
ملا دیا مجھے پھر ان سے آنکھ نے مل کے
ہرے بھی ہو گئے پھر دل کے زخم چھل چھل کے
تمام عمر ہی بحر طلب میں چلتی رہی
نہ ہو سکی کشتی امید پاس ساحل کے
غضب خدا کا مرے دل پہ کر لیا قبضہ
تمہاری آنکھ نے لڑ کے نگاہ نے مل کے

شیخ جی ٹھوکریں کھاتے ہیں در مسجد پہ
اس سے ثابت ہے کہ آتے ہیں یہ میخانے سے
آپ کے در دل نے کچھ آپ کی تعظیم نہ کی
بیٹھے نہ تو اٹھا آپ کے آجانے سے
عکس کاکل کا رخ صاف پہ کیوں ڈالتے ہو
دیکھو آئینہ بگڑ جائے گا بال آنے سے

ظالم کہاں کہاں ترے تیر نظر گئے
دل کی طرف گئے کبھی ہو کے نظر گئے
جانا یہ کچھ نہیں کہ گئے منزل عدم
آنا یہ کچھ نہیں کہ ادھر آئے ادھر گئے
ملک عدم کا حال ادھر کس سے پوچھو
آیا نہ پھر کے ایک بھی جتنے ادھر گئے

یہ مثل سچ ہے کہ گھر کا چور ہاتھ آتا نہیں
کیا کہوں کس کو بتاؤں چور دل کا دل میں ہے
کھولنا ہی آنکھ مثل زخم ہر اک وار پہ
اور اک دو ہاتھ قاتل دم ابھی بسمل میں ہے

بے تمھارے ہے اندھیرا کچھ اجالا ہو تو ہو
دل میں گر روشن کوئی داغ تمنا ہو تو ہو

ساغرِ مے پر گماں ظرفِ وضو کا ہو تو ہو
شیخ صاحب کا ہی رندوں سے جھگڑا ہو تو ہو

کشتۂ فرقت کے جینے کی کوئی صورت نہیں
آپ کی ٹھوکر سے یہ مردہ جو زندہ ہو تو ہو

بعدِ فنا جو دل میں رہی یاد یار کی
ہمراہ میرے ایک ہی حسنِ عمل گیا

وہ کیا حسین حسن تو ہو شوخیاں نہ ہوں
وہ پھول کیا ہی رنگ تو ہو اور بو نہ ہو

نکلا نہ آج تک میرا ارمان ایک بھی
اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

کیونکر نہ باغ باغ ہوں وہیں پہنچ کے ہم
رحمت جو کوچہ باغِ جناں کا نمونہ ہو

ہو کے زخمی خوب گلدستہ میرا دل ہو گیا
لیجئے آپ سامنے رکھنے کے قابل ہو گیا

پہلے کب اتنی کھٹک دل میں تھی ارمانوں کی
مہربانی ہے یہ ٹوٹے ہوئے پیکانوں کی

شان رکھتے ہیں وہ دلبر لئے ہی دیوانوں کی
دھجیاں آپ کریں جن کے گریبانوں کی

قفس میں بھی ہیں یاد سیر گلوں کی صیاد
دل کے داغوں میں بہاریں ہیں گلستانوں کی

کس قدر ہوتے ہیں [illegible] دھلانے والے
کبھی پروا نہ ہوئی شمع کو پروانوں کی

آن بان آج عجب ہے ترے دیوانوں کی
دھجیاں پڑتی ہیں قدموں میں گریبانوں کی

حسینوں کا ہمارے پاس جب کوئی پیام آیا
تمھاری دل میں یاد آئی تمھارا لب پہ نام آیا

شبِ غم کی مصیبت میں یہی ہمدم رہا میرا
برا تھا یا بھلا میرا یہ دل ہی میرے کام آیا

مکرّم پہاسو

(نواب ممتاز الدولہ) مکرم علیخاں صاحب نام مکرّم تخلص ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے پہاسو کے رئیس اور جے پور کے جاگیردار ہیں۔ خوش خلق اور نیک طینت وجیہہ خوش باش اور دریا دل انسان ہیں۔ عالی ظرف دخترِ رز کے پرستار تغزل کے لوازمات فراہم رکھتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں نظم ونثر کے بجائے نظم وغزل سے وابستگی ہے۔ ایام جیپور میں بیشتر اور پہاسو میں کمتر گزرتے ہیں۔ اپنی جگہ شعر وادب کی سرپرستی کرتے ہیں۔ کنور محمد اکرم علی صاحب کے خلف اکبر اور آنریبل نواب ممتاز الدولہ مرحوم فیاض علی خاں صاحب کے۔ سی۔ ڈی۔ او۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ پی۔ آئی۔ رئیس اعظم پہاسو ضلع بلند شہر دزیر اعظم جیپور کے جانشین ہیں۔ ہندوستان کے مشہور زمانہ راجہ سالباہن کی اولاد میں سے ہیں۔ راجہ لعل سنگھ جو اکبر اعظم کے مقتدر وزرا میں سے تھے۔ اور اسی عہد میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور رُوسا دان پور۔ چھتاری۔ دھرمپور۔ دانپور۔ اٹوٹا۔ طالب نگر۔ پہاسو منڈو۔ باغپت۔ وغیرہ لال خانی کہلاتے ہیں۔

حسن کا وار چل ہی جاتا ہے
رنگ دل کا بدل ہی جاتا ہے

ضبط کی تاب جب نہیں رہتی
دل سے نالہ نکل ہی جاتا ہے

عشق فولاد ہو کہ پتھر ہو
دل کے سانچے میں ڈھل ہی جاتا ہے

حسن، کافر ہے چیز ہی ایسی
دل، مکرّم! مچل ہی جاتا ہے

تم اپنے مریضِ محبت کی حالت
خدا کے لئے اک نظر آ کے دیکھو

محبت کی تم زندگی کچھ نہ پوچھو
مری شام، میری سحر آ کے دیکھو

اسیروں کی حالت اگر دیکھنی ہے
تو زنداں کے دیوار و در آ کے دیکھو
رہی مستی و رندی و بادہ نوشی
مگر تم کی شام و سحر آ کے دیکھو

سحر کی ساعتوں میں مسکرانے کون آتا ہے؟
جہانِ رنگ و بو کو جگمگانے کون آتا ہے؟
مجھے وہ سجدہ کرتے دیکھکر درباں یہ کہتے ہیں
یہ میرے در پہ قسمت آزمانے کون آتا ہے؟
تری چشمِ کرم ساقی! مجھے مجبور کرتی ہے
کسی کی بزم میں پینے پلانے کون آتا ہے؟

عقدہ کھلا یہ حسنِ حقیقت طراز کا
عالم تمام عکس ہے آئینہ ساز کا
پردے تمام حسنِ حقیقت کے کھل گئے
توڑا طلسم جبکہ نظر نے مجاز کا
عصیاں پہ مجھ کو ناز ہے اور ناز کیوں نہ ہو
سایہ ہے مجھ پہ رحمتِ عصیاں نواز کا

حواس و ہوش کھو کر اہلِ عرفاں ہو کے آیا ہوں
درِ ساقی سے میخانہ بداماں ہو کے آیا ہوں
درِ پیرِ مغاں میرے لئے بابِ حرم نکلا
میں کافر بن کے پہونچا تھا مسلماں ہو کے آیا ہوں

گذرا تھا کس طرح سے زمانہ بہار کا
دل کو سنا رہا ہوں فسانہ بہار کا
دھوکا دیا گلوں نے کبھی بجلیاں گریں
میں کس طرح ہوا ہوں نشانہ بہار کا
آنکھوں میں اشک بھی ہیں مری لختِ دل بھی ہیں
بیٹھا لٹا رہا ہوں خزانہ بہار کا

گزری ہے عمر میری مکرّم ! گلوں کے ساتھ
اب بن کے رہ گیا ہوں فسانہ بہار کا

اور بھی ہوتا ہے مستحکم مرا عہدِ وفا
جس قدر مجھ پہ ستم جتنی جفا کرتے ہیں آپ

اللہ اللہ کیا ادائیں ہیں خرامِ ناز کی
جس طرف جاتے ہیں اک محشر بپا کرتے ہیں آپ

کس کے ہوتے ہیں مکرّم ! یہ حسیں یہ نازنیں
ان سے ناحق کوئی امیدِ وفا کرتے ہیں آپ

میں ہوں وہ خوش بخت و خوش کامِ حیات
موت سے لیتا ہوں پیغامِ حیات

منزلیں ہیں عشق کی وہ منزلیں
ڈگمگاتے ہیں جہاں گامِ حیات

موت کا پیغام ہیں موئے سفید
صبحِ پیری کو سمجھ شامِ حیات

کیوں مکرّم ! اب کو ہو دنیا کا غم
ایک میرا دل اور آلامِ حیات

خیر ہو یارب ! اسیرانِ وفا کی خیر ہو
آج ہنگامہ نظر آتا ہے زنداں کے قریب

طوفانِ اشک دیکھ نہ یوں پے بہ پے اٹھا
لینا ہے تجھ سے کام ابھی چشمِ تر بہت

اللہ رے یہ رحمت و عصیاں کا تعلق
میخانہ اِدھر بند، درِ توبہ اُدھر بند

ساقی ہمیں حرام ہے پینا ترے بغیر
خالی پڑے ہیں ساغر و مینا ترے بغیر

جس زندگی کو ایک نفس بھی نہیں قرار
اُس زندگی پہ ناز کئے جا رہا ہوں میں

پھر ہوگا نیا گردشِ ایام کا نقشہ
یہ ظلمتِ شب نورِ سحر ہو کے رہے گی

جس روز سے ہم نے توبہ کی وہ گرمیٔ محفل ختم ہوئی
ساقی بھی شکستہ خاطر ہے میخانہ بھی آباد نہیں

ان کا کرم بھی دیکھا، غم بھی سہے جفا بھی
اب تو یہاں خموشی عادت سی ہو گئی ہے

مجھ کو حسرت مندِ فصلِ گُل قفس میں دیکھ کر — پھول برساتی ہے چشمِ خونفشاں میرے لئے
قفس میں جو بہا تھا خونِ حسرت چشمِ بلبل سے — وہ آخر رنگ بن کر پھوٹ نکلا ہر رگِ گل سے
اشک بھر آئے بھی آنکھوں میں تو رونا یہ ہے — کسی دامن کے یہ قابل نہیں ہونے پائے
دو عالم کی فرماں روا ہے محبّت — بالفاظِ دیگر خدا ہے محبّت
ہو اس طرح سے حسن و محبّت میں اتحاد — دِل اُن کے دِل کے ساتھ نظر ہو نظر کے ساتھ
دشت میں عریاں تنوں کا میں نے پردہ ڈھک دیا — میرے اک دامن سے سو کانٹوں کے پیراہن بنے
میرے مرنے کی ہو رہی ہے دُعا — ان کی محفل میں شورِ آمیں ہے
کیونکہ ہو اس زمین پر ہم کو سکوں نصیب — پیدا ہوئے ہیں زمین پہ رہ کر آسماں سے
کٹتے ہیں کس طرح سے جدائی کے رات دِن — اپنے غمِ فراق کے ماروں سے پوچھئے
ساقی! تری نظر کا انداز کہہ رہا ہے — ہو کر رہے گا اک دن سارا جہاں شرابی
اللہ رے انداز، لبوں پہ ہے تبسّم — اور نیچی نگاہوں سے حیا کھیل رہی ہے
مری میکشی اے محتسب! مری ذات کا ہی معاملہ — تجھے بازپرس کا حق ہی کیا کہ گناہگارِ خدا ہوں میں
مجھے اپنی نگاہوں سے گرا کر — اِک افسانہ بنایا جا رہا ہے
اُسی سمت دُنیا کا رُخ ہو گیا — کہ جس سمت اُن کی نظر ہو گئی
تیرا در جب سے چھٹا تیری محبّت کی قسم — کہیں بیٹھا نہ اُٹھا، میں کہیں آیا نہ گیا
فیضِ ساقی گر سلامت ہے تو اِک دن دیکھنا — لاکھ میخانے بنیں گے ایک میخانے کے پاس
پروانہ وار بزم میں قرباں ہیں اہلِ بزم — بیٹھے ہیں خود وہ شمع سراپا بنے ہوئے
کر دیا ہم کو محبّت نے تباہ — وہ یہ کہتے ہیں محبّت ہی نہیں
مکرّم! کس کی توبہ، عہد کیسا، پاسِ ایماں کیا — بہار آئی ارے کافر! بہار آئی

اِدھر جام اوٹھایا، اُدھر توبہ کرلی — مکرم تم بھی ہیں کیسے اللہ والے

مضطر گلاوٹھوی

مشتاق حسین نام گلاوٹھی وطن ہے۔ مضطر تخلص فرماتے ہیں۔ مقامی اساتذہ میں شمار ہے۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت تحر شاہجہانپوری کے شاگرد ہیں۔ پختہ گو ہیں۔ موضوعی اور تقریبی نظمیں لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ بلند آواز سے پڑھتے ہیں اور مشاعرہ پر چھا جاتے ہیں۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ سے مضامین پر زور دیتے اور مفاہیم ذہن نشین کرانے کا کام لیتے ہیں۔ بندشیں عموماً چست ہیں اور زبان صاف۔ روزمرہ اور محاورہ کا لطف ملتا ہے۔ غزلوں میں بھرتی کے اشعار سے گریز ہے۔ نشتر کے ہمعصر ہوں گے۔ آپ کا ادارہ المخلافت سکندرآباد ہے۔ انکی راجدھانی گلاوٹھی تاسف خورجہ کو سنبھالے ہوئے ہیں اور شورخ ملیشہر میں متمکن ہیں۔ ضلع کے چہار اقطاب مضطر کا قد میانہ اور رنگ گندمی ہے۔ بھری ہوئی سفید ڈاڑھی، چہرہ پر ذہانت کے نقوش ہیں اور شاندار ذاتی انبائے زمانہ کا شکوہ۔ امانت پہ معمور ہیں۔

قاتل کی نظر چوک گئی میری نظر سے — آئی ہوئی اللہ نے ٹالی مرے سر سے
للہ ستائیں نہ ابھی مجھ کو نکیرین — میں آپ تھکا آیا ہوں دنیا کے سفر سے
آنسو کی طرح خاک میں ملتے ہوئے دیکھا — اٹھتے ہی نہ دیکھا جو گرا تیری نظر سے

کہاں گیا وہ زمانہ کہ اک زمانا تھا — خدائی بھر کے بتوں میں میرا فسانا تھا
فضول بعدِ فنا دشمنوں نے بہلایا — کبھی وہ دن تھے ہمارا ابھی آنا جانا تھا

انھیں تو آگ لگانی تھی طورِ سینا کو
یہ بات چیت کا موسیٰ سے اِک بہانا تھا

ہم اس فصیح زباں کے ہیں معتقد مضطرؔ
جسے امیرؔ سے اوستاد نے بھی مانا تھا

اچھے رہے وہی، وہی کچھ کام کر گئے
دم توڑ کر جو آپ کے قدموں پہ مر گئے

کبھی ناوک سنبھلتے ہیں کبھی خنجر نکلتے ہیں
ہمارے جان لیوا بے طرح تیور نکلتے ہیں

گلا گھونٹے سے ظالم رک نہیں سکتے مرے نالے
نکل کر جانے والوں کے لئے سو گھر نکلتے ہیں

مرا دم تیرے خنجر سے گلے مل کر نکلتا ہے
مرے ارمان دل تجھ سے گلے مل کر نکلتے ہیں

جناب شیخ جائیں میکدہ سے بے پئے توبہ
یہ پیکر پینے والوں کو دعا دیکر نکلتے ہیں

اس شان سے وہ شوخ ستم آزما ہوا
اس پر خفا ہوا کبھی اس پر خفا ہوا

کیا جانے کیا کمال ہے پیرِ مغاں میں یہ
آیا جو اس کے پاس وہی پارسا ہوا

جس دم کو ہم سمجھتے تھے ہمدم حیات کا
افسوس دیکھے دم ہمیں وہ بھی ہوا ہوا

اپنا ہی خط ملا ہمیں خط کے جواب میں
آیا ہمارے آگے ہمارا لکھا ہوا

مضطرؔ خدا کو یاد کرو ایسے وقت میں
آتا نہیں ہے عہدِ جوانی گیا ہوا

فرقت کا وصل میں بھی تو ہر دم خیال ہے
اتنی مجھے خوشی نہیں جتنا ملال ہے

میں اور بیوفا ہوں۔ غلط ہے محال ہے
میں اور یہ خیال۔ تمہارا خیال ہے

ناطق۔ فدا۔ خیال۔ تخیل و حسن۔ امیر
مضطر گلاؤٹھی میں ہر اک باکمال ہے

پارسائی کو بھی کیا چھیڑ ہے میخانے سے
توبہ کترا کے نکل جاتی ہے پیمانے سے

نکلی چالاک کی پیماں شکنی بھی چالاک
ساز ہے اس کا تو ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

لڑ چکی آنکھ تو پہلے ہی بھری محفل میں
اب بھلا فائدہ کیا آپ کے چھپ جانے سے

گھاتیں تو دیکھئے نگہ شرمسار کی
بھڑکا دی اور آگ دلِ بیقرار کی

کثرتوں میں جو چھپایا تری یکتائی نے
وہ بھرم کھول دیا انجمن آرائی نے

ہائے یوں دشمنِ جاں کون کسی کا ہو جائے
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ تجھ سا ہو جائے

دیکھنے والے تماشائے جہاں دیکھ کے دیکھ
کہیں ایسا نہ ہو تو آپ تماشا ہو جائے

ہے مری ذات سے وابستہ گلستاں کی بہار
میں گلستاں سے نکل جاؤں تو صحرا ہو جائے

کیا بتاؤں کہ انھیں آج کہاں دیکھا ہے
ابھی کہہ دوں تو اسی بات پہ جھگڑا ہو جائے

حق بات کے کہنے پہ یہاں دار و رسن ہے
کیا حشر ہو کچھ منہ سے نکل جائے اگر اور

یہ گردشیں تیری تو بہت دیکھ چکے ہم
کچھ کھیل دکھا اے فلکِ شعبدہ گر اور

وجہِ فنا ہے رابطۂ جسم و جاں مجھے
دونوں کے اس ملاپ نے مارا لیا مجھے

یا میں ہوں جس جگہ دلِ آجائیں آپ بھی
یا جس جگہ ہوں آپ بلا لیں وہاں مجھے

یوں ہیں چپ چاپ وہ اپنا بنا لیتے ہیں دنیا کو
نہ کچھ تحریر کرتے ہیں نہ کچھ تقریر کرتے ہیں

داغِ دل کے بھی نہ روشن کئے اے عزیزوں
اپنے گھر کے بھی چراغ آپ جلائے نہ گئے

ایک بجلی سی کیسی کوند گئی — وہ ادھر سے ادھر گئے شاید
آتے آجاتے، اب نہ آئیں گے — آج دشمن کے گھر گئے شاید

وہ ہچکیوں میں ٹوٹ گیا رشتۂ حیات — یہ اختصار ہے مری عمرِ دراز کا

ہر ایک خاک کے پتلے کو دیکے اپنی ادا — ہماری جان کا دشمن بنا دیا تو نے
تجھی کو آپ تری یکتائیاں مبارک ہوں — ہمیں تو غیر سمجھ کر اٹھا دیا تو نے
مری نظر میں ہیں وہ برق پاشیاں تیری — مجھے ازل ہی سے مضطر بنا دیا تو نے

ہر جلوہ میں اک جلوہ باندازِ دگر ہے — حیران ہر اک دیکھنے والے کی نظر ہے
کہتے ہیں وہ مضطر مرے اشعار کو سنکر — کیا سیدھی سی اردو ہے اگر ہے نہ مگر ہے

بشر بھی آکے دنیا میں عجب شانیں دکھاتا ہے — کھلونا بن کے آتا ہے تماشہ بنکے جاتا ہے
وہی میں تھا کہ ہاتھوں ہاتھ دنیا نے لیا مجھ کو — وہی میں ہوں زمانہ خاک میں مجھ کو ملاتا ہے

ہستی کا اپنی آپ جنازہ لئے ہوئے — پھرتا ہوں اک عجیب تماشا لئے ہوئے
مینا بدوش ساغرِ صہبا لئے ہوئے — آجا مرے شباب کی دنیا لئے ہوئے
پست و بلند ایک ہیں میری نگاہ میں — دونوں جہاں کا بار ہوں تنہا لئے ہوئے

سرِ مقتل چھری رکھ کر مری گردن پہ کہتے ہیں
یہ جانِ مبتلا تیسری بنا تیری ہے یا میری

خوشی کیا ہے اگر وہ مہرباں ہے
کہ ظالم آسماں پھر آسماں ہے
ہمیشہ بجلیاں گرتی ہیں جس پر
خدا رکھے وہ میرا آشیاں ہے
قیامت میں سُنے گا کون میری
جدھر وہ ہیں اُدھر سارا جہاں ہے
کلام حضرت مضطر کی کیا بات
زبانِ بلبلِ ہندوستاں ہے

حرم ہے دیر ہے قلبِ حزیں ہے
وہ کس گھر میں ہے کس گھر میں نہیں ہے
ابھی پہلو میں تھا دل اب نہیں ہے
نگاہِ یار تجھ کو آفریں ہے
نکل آتے ہیں آنسو ہنستے ہنستے
مسرت بھی مری غم آفریں ہے

اے دل فریب خوردہ سامانِ زندگی
لوحِ فنا پہ تربت ہے عنوانِ زندگی
ایک ایک سانس عالمِ صد انقلاب ہے
یا رب شباب ہے کہ یہ طوفانِ زندگی
تعبیر اس کی اس کے سوا اور کچھ نہیں
دنیا ہے ایک خوابِ پریشانِ زندگی
آزاد کر دے اے دلِ مضطر ترے نثار
اب تو تڑپ کے توڑ دے زندانِ زندگی

گل ہنسے ہیں تازہ پھولوں میں خوش الحانِ بہار
کس قدر سنجیدہ نکلے نغمہ سنجانِ بہار
پھر مری صحرا نوردی پر گریں گی بجلیاں
پھر اُٹھا ہے دامنِ صحرا سے طوفانِ بہار
جوشِ فصلِ گل پہ جب آئی نہ پیری چل سکی
سو گئی تھک کر خزاں بھی زیرِ دامانِ بہار
عجب ہی ہستی موہوم اپنی بزمِ امکاں میں
تماشائی ہے گلشن میں تماشا ہے بیاباں میں

جب چلے وہ مری ہستی کو مٹانے کے لئے
شوخیاں آ گئے ہوئیں راہ بتانے کے لئے

گرمیٔ حسن سے پھونکا ہے سراپائے وجود
گھر ملا خوب تمھیں آگ لگانے کے لئے

شمع نے بھی نہ دیا ساتھ شبِ غم میرا
یہ بھی ٹھنڈی ہوئی میرے ہی جلانے کے لئے

رہروِ راہِ عدم تیری روش کے قرباں
نہ رکھا نقشِ قدم کھوج لگانے کے لئے

بحرِ عالم میں حبابِ لبِ ساحل تھا میں
ایک دم بھی نہ رہا موج اُڑانے کے لئے

جستجو نے تم کو مضطر کر دیا محرومِ دید
سامنے تھا روئے جاناں تم کدھر دیکھا کئے

ملا نہ عمر کو جب منزلِ فنا کا پتہ
قضا کو بھیج دیا راستہ بتانے کو

نگاہِ مست کا کرتا ہوں بار بار طواف
بنا رہا ہوں میں کعبہ شراب خانے کو

رگِ گلو سے قریب اور حشر کا وعدہ
وہ پاس آئے بھی تو دور کی بتانے کو

کیا تو اضح مست کی اتنی ہی میخانے میں ہے
کتنی میخانے میں ہے کتنی ہی پیمانے میں ہے

چار قیدی چھوٹ جاتے ہیں ہمیشہ کیلئے
ایک یہ زندہ کرامت میرے مرجانے میں ہے

میخانہ و حرم میں بس اتنا ہی فرق ہے
عالم وہ حال کا ہے یہ دنیا ہے قال کی

یہ میرے دل میں کس نے گرمیٔ عشقِ بتاں رکھ دی
الٰہی اس پھونس کے گھر میں یہ چنگاری کہاں رکھ دی

مرے قاتل نے جب گردن پہ تیغِ جاں ستاں رکھ دی
خدا رکھے اسے بنیادِ عمرِ جاوداں رکھ دی

جبینِ شوق اُن کے آستاں پہ بے گماں رکھ دی
جہاں کے واسطے جو چیز موزوں تھی وہاں رکھ دی

خزاں لوٹے اڑائیں آندھیاں یا بجلیاں پھونکیں
خدا کے نام پر اب تو بنا کے آشیاں رکھ دی

ہمارے دل میں تھی اک چیز وہ دل لیکے ظالم نے
خُدا جانے کہاں پھینکی کہاں ڈالی کہاں رکھ دی

چمک اٹھتی ہے اک بجلی سی جو اکثر فضاؤں میں
وہ اک پرچھائیں ہے مضطر مری عمرِ گریزاں کی

کون چھیڑے تیری زلفوں کو ترے سر کی قسم
کون دیوانہ بنے کون پریشان ہو جائے

اللہ اللہ انکی رسوائی بھی کتنی عام ہے
ساری دُنیا کی زباں پر اب انھیں کا نام ہے

اُف جُدائی کی یہ راتیں اُف جدائی کے یہ دن
کس قیامت کی سحر ہے کس بلا کی شام ہے

یاد کرتے کرتے اُن کو لے کے ہچکی سو گیا
اب مریضِ ہجر کو آرام ہی آرام ہے

مرے دل کی دھڑکنوں میں رگِ جاں کی جستجو ہے
وہ یہیں کہیں ہیں لیکن یہ پتہ نہیں کہاں ہے

مرے چارہ گر غلط ہے جو علاج کر رہے ہیں
اُسے کیوں نہیں بلاتے جو مرا مزاج داں ہے

مجھے کیا گلہ فلک سے وہ مجھے سکون کیا دے
اُسے چکروں سے اپنے ابھی ہوش ہی کہاں ہے

دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں ہر آواز کے ساتھ
کون ٹکراتا ہے پیمانے سے پیمانے کو

جلنے کیا پھونک گیا کان میں جاتے جاتے
رات بھر شمع جو روتی رہی پروانے کو

عجیب بات ہے پیرِ مغاں کی باتوں میں
بہت سی باتیں تو باتوں میں ہو گئیں معلوم

آج دورِ گردشِ ایّام کام آ ہی گیا
چلتے پھرتے پاس تک اپنے بھی جام آ ہی گیا

کیوں نہ دیتے ناصحِ ناداں کی باتوں کا جواب
آدمی تھے ہم بھی جوشِ انتقام آ ہی گیا

میکدہ آباد ساقی کی کرامت کے نثار
جب کسی کے منھ سے نکلا جام جام آ ہی گیا

بچ کے نکلے تو بہت لیکن اب اس کو کیا کریں
میکدہ کی راہ میں بیت الحرام آ ہی گیا

عظیم :-

نام مولوی محمد عظیم ۔ عظیم تخلص ۔ وطن سکندرآباد ۔ تاریخ پیدائش سنہ ۱۹۰۰ء ، والد ماجد کا نام محمد شبیر دل خاں ، ابتدائی تعلیم خورجہ مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ میں حاصل کی آپکو شاعر فطرت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

آنکھ مری اشکبار دیکھئے کب تک رہے
آہ یہ دورِ بہار دیکھئے کب تک رہے

اُن کو ستم کی ہے ضد مجھ کو قسم آہ کی
قلب کا ضبط و قرار دیکھئے کب تک رہے

تم تو عطا کر چکے عشق کی بیتا بیاں
دل پہ مرا اختیار دیکھئے کب تک رہے

گریہ بصد اشکِ خون نالہ بصد چاکِ دل
عشق کا یہ حالِ زار دیکھئے کب تک رہے

انجمنِ شوق میں تیری نگاہِ کرم
مرکزِ صبر و قرار دیکھئے کب تک رہے

حسن کی خلوت بھی دور صبح قیامت بھی دور
منظرِ شب ہائے تار دیکھئے کب تک رہے

رُخ ہے ترا بے نقاب ہر کو ہے اضطراب
دیدۂ دیوانہ وار دیکھئے کب تک رہے

ہر نفسِ ہجر آب اُن کی حضوری میں ہے
عشق ہے مصروفِ کار دیکھئے کب تک رہے

ہائے یہ گیسوئے یار جن کا بکھرنا بہار
موجِ ہوا مشکبار دیکھئے کب تک رہے

آپ کا یہ اضطراب یوں سرِ مژگاں پر آب
جذبِ وفا شرمسار دیکھئے کب تک رہے

برقِ نشیمن کے گرد آتشِ گل کا یہ ورد
اُف یہ نظامِ بہار دیکھئے کب تک رہے

آمد و شد آپ کی دل میں یہ اور ضعفِ دل
نبضِ وفا کو قرار دیکھئے کب تک رہے

رہ نہ سکے رو برو عشق کے ارض و سما
جانِ عظیم زار دیکھئے کب تک رہے

ہمراہ ہر اشکِ خونیں کے دل کا اک ٹکڑا آیا ہے
اب اُسکی حقیقت کیا کہئے آنکھوں نے جو منھ پر برسایا ہے

فردوس کی جانب کیا دیکھوں فردوس کو تجھ سے کیا نسبت
تجھکو میں نے راہِ دلبر دو عالم ٹھکرایا ہے

اے جور کے خوگر یوں نہ جھجک اس وقت ہیں نالے عرش فلک
یہ پوچھ تو لے کیوں ہاتھ مرا تیرے دامن تک آیا ہے

جن آنکھ نے تجھکو دیکھا ہو وہ تیرے سوا کیا دیکھیگی
جس سمت نگاہیں اٹھتی ہیں واللہ نظر تو آیا ہے

معلوم نہیں کیا اس نے کہا رگ رگ میں ہے لیکن برق صدا
ہلکی سی لبوں کی جنبش نے رہ رہ کے مجھے تڑپایا ہے

اب دل کی نزاکت کیا کہئے احساس کی شدت کیا کہئے
جھونکا جو ہوا کا آیا ہے تیرا ہی تصور لایا ہے

وہ آ کے تھے مدت گزری لیکن ہے اثر اب تک باقی
دیوانے کی ہر وحشت پہ اک رنگ انوکھا چھایا ہے

گلزاروں میں انکی طالب صحراؤں میں ان کی جویا
اللہ اللہ ان نظروں نے کیا زخمِ تمنا کھایا ہے

ان نازک لوگوں کی دنیا پہ کتنا ہے لبِ نگیں کا اثر
لبیک کہا ہے پھولوں نے جب آپ نے کچھ فرمایا ہے

ناطق :-

نام مولانا سید ابو الحسن تخلص ناطق متوطن قصبہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر مقیم ناگپور تلمیذ حضرت داغ دہلوی طالب اللہ ثراہ عمر تقریباً ساٹھ سال، آپ عرصہ سے ترک سکونت کر کے ناگپور چلے گئے ہیں، نہایت کہنہ مشق استاد ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جہاں حاجت نہ تھی اسکی وہاں سایہ نہ تھا قد کا
خدا رکھے ہمارے سر پہ سایہ ہے محمدؐ کا

وہ نازِ نوح و آدم منبعِ علمِ لدنی تھا
نہ تھا محتاجِ ابجد کیلئے کچھ کام ابجد کا

وہ بنکر رابطہ لایا عدم سے ہر دو عالم کو
کہ حرکت بالسکوں ہے خاصہ حرفِ مشدد کا

آیا تو دلِ وحشی در بندِ نیاز آیا
برگشتہ مقدر تھا سرگشتۂ ناز آیا

اک حرفِ شکایت پہ کیوں روٹھ کے جاتے ہو
جانے دو گئے شکوے آ جاؤ میں باز آیا

ہاں شورشِ طوفاں ہر سامانِ ہم آہنگی
اے نغمہ نوازِ غم لے خوب یہ ساز آیا

راحت گہہ تربت سے تو نے تو بہت روکا
مر مر کے مگر میں بھی اے عمرِ دراز آیا

بھولا ہوا پھرتا ہے دل اپنی حقیقت کو
لے اے غمِ ہستی لے اک محوِ مجاز آیا

تو آخر سازِ ہستی کیوں طرب آہنگِ محفل تھا
نشاط آئینِ کیفیت بے دلی یارب اگر دل تھا

تماشہ اضطرابِ زندگی تھا مرنے والوں کا
وجودِ بزمِ عالم اک نظامِ رقصِ بسمل تھا

مقام ہو، سو یہ اسے مجرّد عالمِ حیرت
مری گم گشتگی ہے اب یہ نقشہ ہے جہاں دل تھا

ہمیں کمبخت احساسِ خودی اس در پہ لے بیٹھا
ہم اٹھ جاتے تو وہ پردہ بھی اٹھ جاتا جو حائل تھا

وہی آشفتہ سامانی وہی ساری غلط کاری
مگر قانونِ قدرت میں مرا معمول عامل تھا

مری وارفتگی وجہ بنائے بزمِ ہستی تھی
مرا رنگِ پریدہ باعثِ نیرنگِ محفل تھا

زبانِ داغ و شانِ ذوق کچھ اپنی نہیں ناطق
ارے یہ کیا کہ تو تو ہمنوائے نوح و سائل تھا

شکستِ توبہ سامانِ شکستِ جام ہوتا تھا
مرے ذوقِ معاصی کو عبث بدنام ہوتا تھا

وہ آنا تھا انھیں میرا برا انجام ہوتا تھا
اب آ کر کیا کریں گے ہو چکا جو کام ہوتا تھا

نہ تھا ان رہروانِ تیرہ قسمت کے مقدر میں
بیاضِ صبحِ روشن کو سوادِ شام ہوتا تھا

غضب ہے دل پہ رنگِ بیکسی چھنے نہیں پاتا
غمِ ہستی تجھے اتنا نہ خوں آشام ہوتا تھا

برا مانا ہے کیا کیا حسن کے اہلِ بزمِ عشرت نے
ہمارے نام کو جا کر فنا گمنام ہوتا تھا

جہانِ نامرادی بھی تو بزمِ اہلِ ہمت ہے
یہیں آ کر تجھے کچھ حسرتِ ناکام ہوتا تھا

غنیمت ہیں لگائے دام جو کچھ اہلِ ہستی نے
ہمیں ناطق اسی بازار میں نیلام ہوتا تھا

بادۂ ہستی آ کرامت ہو کے میخانے میں آ
چل تری شیشے سے اڑ کر میرے پیمانے میں آ

وحشتِ دل کی نہیں تدبیر جز افسردگی
تنگیٔ زنداں کسی پہلو سے دیوانے میں آ

کر رقم کچھ نئے انداز سے اپنا بیاں
مرنے والے زندگی چاہے تو افسانے میں آ

چل نکل جائیں اِدھر سے اپنی دنیا کی طرف
آ تو لے تارِ نفس تسبیح کے دانے میں آ

دامنِ فانوس میں اے شمع خودداری کہاں
کسوتِ ناموس اگر چاہے تو پروانے میں آ

پیلِ زور آپے سے باہر ہو کے جائیگا کہاں
آدمی بن آدمی آ اپنے پیمانے میں آ

ہو چلی ہے رسمِ اہلِ کعبہ ناطق اب تو عام
برہمن بھی مجھ سے کہتا ہے کہ بتخانے میں آ

ہوئی ختم عمرِ رواں جہاں میں رہ گیا وہ لیا دیا
سرِ حشر کس کا حساب دوں مجھے تھا جو آپ نے کیا دیا

یہ کرم ہے کاتبِ بخت کا کہ سمجھ میں آئی نہ زندگی
مرے انتظامِ حیات میں کوئی نام تھا جو اڑا دیا

یہ جہان کیا یہ نمود کیا سرِ ہست کیا غمِ بود کیا
یہیں ہم بھی تھے جو آ کے گئے یہیں گھر بھی تھا جو اڑا دیا

غمِ ہستی میں پھر اور کیا مری کائنات تھی اے جنوں
نہ ہی ایک دامنِ صبر تھا جو ترے کفن کو لگا دیا

کوئی نامرادِ وفا بھی ہے جسے کچھ تمہیں سے گلہ بھی ہو
یہ بجا درست مگر تمہیں مرا نام کس نے بتا دیا

کوئی راز تھا کوئی بات تھی مری گفتگو تھی فسوں نہ تھا
دمِ عرضِ حال یہ کیا ہوا تمہیں بت خدا نے بنا دیا

سرِ برگِ ناطق وہ داغِ دل جو نہ مٹ سکے نہ مٹا سکے
یہ خدا کی دین تو دیکھئے اسے غم دیا بھی تو کیا دیا

اضطرابِ دل میں آ جا کہ دوام آ ہی گیا
زندگی کو ایک حالت پر قیام آ ہی گیا

اتفاقاً اس گلی سے بڑھ گئی عمرِ رواں
میں تو سمجھا تھا کہ اب میرا مقام آ ہی گیا

رند جانے رند کا ایمان جانے شغلِ رند
پند گو کے منھ تک آنا تھا حرام آ ہی گیا

انتظامِ روزِ عشرت اور کرائیے نامراد
عید آتی ہی رہی ماہِ صیام آ ہی گیا

ہو گئی آوارہ گردی بے گھری کی پردہ دار
کام جتنا ہمکو آنا تھا وہ کام آ ہی گیا

بندگی آموزِ بزمِ زندگی بیچارگی
آدمی کو جب غرض اٹکی سلام آ ہی گیا

بات کیا چھپتی کہ تھا اپنا جدا طرزِ کلام
نام آیا بھی نہ تھا ناطق کہ نام آ ہی گیا

مجھ پہ اتنا تو کرم گردشِ دوراں ہوتا
یہ تو ہوتا کہ کہیں بیٹھ کے گریاں ہوتا

شدتِ درد ہی ہوتی کہیں غارت گرِ ہوش
بخت اتنا تو نہ برہم زنِ ساماں ہوتا

چارہ گر کوششِ بے سود ہے تدبیرِ علاج
ہم نہ ہوتے تو مرض قابلِ درماں ہوتا

پوچھتے کیا ہو سببِ دفنِ دلِ زار کے بعد
میں مصیبت زدہ اب بھی نہ ہراساں ہوتا

ناز تھا روزِ مسرت پہ کسے اے شبِ غم
ہم نہ ہوتے تو کوئی اور پشیماں ہوتا

لے جنوں باعثِ بدحالیِ صحرا کیا ہے
یہ میرا گھر تو نہیں تھا کہ جو ویراں ہوتا

ہم تو مسجد سے بھی مایوس ہی آئے ناطق
کوئی اللہ کا بندہ تو مسلماں ہوتا

خراب خانۂ خلنہ خراب ہو نہ سکا
یہاں کوئی اثرِ انقلاب ہو نہ سکا

غبارِ شورشِ سہلِ بلا میں کیا اٹکتا
جہاں سرمۂ چشمِ پُر آب ہو نہ سکا

نبردِ شوق و حریفِ مرادِ بختِ سیاہ
لڑا تو میں بھی مگر کامیاب ہو نہ سکا

نگاہِ مست سے دلجوئیِ حزیں نہ ہوئی
گناہ گار سے کارِ ثواب ہو نہ سکا

ہوس مسرتِ دولت سے تشنہ کام رہی
وفورِ آب نقیضِ سراب ہو نہ سکا

بیانِ حال میں طولِ کلام لاحاصل
زیادہ یہ ہے کہ کم اضطراب ہو نہ سکا

ہوا نہ خاک نشینی سے عارِ ناطق کو
شکستہ دل پسرِ بوتراب ہو نہ سکا

اندازۂ روز و شبِ ہجراں نہیں ہوتا
دن رات میں کچھ فرق نمایاں نہیں ہوتا

ہاں یہ تو بتا اے دلِ محرومِ تمنا
اب بھی کوئی ہوتا ہے کہ ارماں نہیں ہوتا

نقصان کے سوا قیمتِ غم کچھ نہیں ہوتی
ہوتا تو بہت ہے مگر ارزاں نہیں ہوتا

تحصیلِ مراد اور مری کوششِ ناکام
آخر یہی ہوتا ہے کہ ساماں نہیں ہوتا

گھر بھی کبھی گھر سا مجھے ہوتا نہیں معلوم
زنداں بھی مرے واسطے زنداں نہیں ہوتا

صورت گرِ آلام کی سوئی ہوئی تقدیر
ہیں خواب پریشاں سے پریشاں نہیں ہوتا

سب کو یہ شکایت ہے کہ سنتا نہیں ناطق
ہم کو یہ تعجب کہ وہ گریاں نہیں ہوتا

عالمِ کون و مکاں نام ہے ویرانے کا
پاسِ وحشت نہیں گھر دور ہے بہلانے کا

زہرِ واعظ کے لئے نام ہے پیمانے کا
یہ بھی کیا مردِ خدا چھوڑ رہے میخانے کا

کوئی ہوں ہاں تو کہے قصۂ غم کس سے کہوں
تم کو سننا نہیں آتا ابھی افسانے کا

کبھی فرصت ہو مصیبت سے تو اٹھ کر دیکھو
کون سے گوشے میں آرام ہے کاشانے کا

دل کی جولاں گہِ وحشت ہے ابد سے موسوم
نام ازل ہے مرے بھولے ہوئے افسانے کا

سوزِ الفت سے ہوا دائرۂ قلزمِ عمر
بادباں ہے مری کشتی میں ہے پروانے کا

دل جو اپنا بھی ہے ناطق تو یہ اپنا نہیں کچھ
ہے جو اپنا ہی تو ہوگا کسی بیگانے کا

صیدِ جمالِ ذوق ہے اہلِ نگاہ کا
حیرت کہوں کہ شور کہوں واہ! واہ! کا

رکھتا ہے تلخ کامِ غمِ لذتِ جہاں
کیا کیجئے کہ لطف نہیں کچھ گناہ کا

ہنگامۂ حیات سے لینا تو کچھ نہیں
ہاں دیکھتے چلو کہ تماشہ ہے راہ کا

اہلِ جنوں پہ ظلم ہے پابندیٔ رسوم
جادہ ہمارے واسطے کانٹا ہے راہ کا

عہدِ وفا سے ہے کفِ افسوس کا سبق
جاں دادۂ شکست ہے پیماں نباہ کا

یادِ شبِ وصال سے ہے سیلِ خانماں
شامِ فراق پرتو ہے مہر و ماہ کا

ناطق گلہ پسند ہے تو غم جفا پسند
لے داد خواہ کام ہے بیداد خواہ کا

نیّر

محمد خان نام نیّر تخلص۔ محمد عمر خان صاحب کپتان کے صاحبزادہ ہیں، گوالیار میں جوڈیشل آفیسر کے عہدہ پر سرفراز تھے، اب پنشن پاتے ہیں آغا شاعر قزلباش مرحوم کے شاگرد رشید ہیں، آپ کا کلام نہایت صاف ستھرا اور بلند ہے اور ذہانتِ مزاج کی نفاست اور سنجیدگی کا غماز، نیّر کی عمر ۶۹ سال ہے

خزاں اور عالم وہ پژمردگی کا بہار اور شادابیٔ بوستانی
بنا ہے یہ ایّامِ پیری کا نقشہ وہ تصویرِ عہدِ عروجِ جوانی

اگر ڈر ہے، اے خضر تو موت کا ہے کہ ہے دارِ دوئے دردِ سوزِ نہانی
خدا سے حیاتِ ابد چاہتا ہوں، بالفاظِ دیگر غمِ جاودانی

یہ ہے واقعہ ہی المناک بیحد نہیں اس میں کچھ میری جادو بیانی
جو باور نہیں ہے تو اک روز سنئے، مرا قصّۂ غم عدو کی زبانی

ندامت سے اور فرطِ حیرت سے چپ ہیں سمجھتے ہیں وہ معنیٔ بے زبانی
کسی اور صورت سے ممکن نہیں تھی مری حالتِ زار کی ترجمانی

ہر اک ولولہ عشق کا مٹ چکا ہے، مگر پھر بھی داغِ تمنّا ہرا ہے
کلیجہ سے اس کو لگائے ہوئے ہوں کہ ہے یادگارِ دلِ آنجہانی

تم آتے نہیں مجھ کو چلنا ہے دو بھر دمِ نزع ہے در پہ آنکھیں لگی ہیں
غرض روح کی کشمکش کا سبب ہے، تمھاری نزاکت مری ناتوانی

بہ ایں کم نگاہی مری آنکھ موسیٰ ہر ایک چیز میں دیکھتی ہے وہ جلوہ
مگر آپ کہتے ہیں تو خیر ہوگا سرِ طور وہ قصّۂ لن ترانی

کہاں تک کوئی غم کا قصہ سنائے، نہیں تم کو آتا یقیں تو نہ آئے
یہ کیا ضد نکالی ہے بیٹھے بٹھائے، دکھانے کی ہے چیز دردِ نہانی؟
کہاں نرگسِ ساقیِ مستِ صہبا، کہ ہے میکشانِ محبت کی دنیا
کہاں جامِ جمشید کا وہ تماشہ، کتابوں کا اک قصۂ پاستانی
نگاہوں میں تھا حسنِ یوسف کا جلوہ کہ دیکھا رسولِ عرب کا سراپا
نہیں بھولنا اک مبصر کا کہنا، کہ وہ نقشِ اول ہے یہ نقشِ ثانی
یہ اشعار ہیں یا مرے دل کے نالے عجب چیز ہے طبعِ موزوں کے صدقے
وہ غیروں سے کہتے ہیں ناداں کو سنئے کہ یہ شخص ہے آج رشکِ فغانی

الاماں وہ ابتدائے عاشقی — انتہائے درد یعنی بیخودی
وہ ہوا منصور کو سودائے دار — دیکھئے وہ یاد آئی آپ کی
ان بتوں کی بے نیازی کا گلہ — کیا کروں جاتا ہے لطفِ زندگی
دل کی حالت میں ہے کتنا انقلاب — تیری نظریں ہیں کہ سحرِ سامری
جب ہنسا گلچیں قفس کو دیکھ کر — آشیاں برباد پر بجلی گری
ہے تغافل جورِ بیجا کی جگہ — دوستی اس کو کہوں یا دشمنی

زندگی صرفِ انقلاب، دہر میں گر کبھی نہ ہو — ذہن و نظر میں کامیاب، عشرتِ زندگی نہ ہو
غم نہ اگر ہو دلنواز، دل سے بھی آگہی نہ ہو — میری خوشی اسی میں ہے میری خوشی کبھی نہ ہو
کیفِ سرور و عیش پر اس کی نگاہ کیوں پڑے — رنج و ملال و یاس کی جس کیلئے کمی نہ ہو

دقفِ خزاں چمن سہی، کیوں ہو اسیر تیرگی
صبح بہار اگر نہیں، شام بہار بھی نہ ہو

ساغر و مے کا اہتمام میرے لئے فضول ہے
جرأتِ لب تو وہ اٹھائے جس نے نظر سے پی نہ ہو

عجز و نیازِ عشق میں رنگ نہ آئے ناز کا
قیمتِ بیخودی اگر حوصلۂ خودی نہ ہو

عرضِ غمِ فراق کا اُس پہ غلط ہے اتّہام
ضبط کے بند و بست میں آہ بھی جینے کی نہ ہو

ہوں ابھی تشنۂ کرم، دل کا نہیں ہے درد کم
میں ہوں ابھی اسیرِ غم، مجھ سے خفا بھی نہ ہو

آگ بھری ہے آج کل میرے چمن میں ہم نشیں
ایسی کوئی جگہ نہیں، برق جہاں گری نہ ہو

اُس کو حدیثِ بیکسی کوئی سنائے کس طرح
جس کے حریمِ ناز میں پُرسشِ حال ہی نہ ہو

راہ روِ رہِ وفا، صبر و رضا سے کام لے
حائلِ منزلِ مراد، شکوۂ نارسی نہ ہو

آئی کدھر سے آج یہ درد بھری ہوئی صدا
صحنِ چمن میں دیکھنا نیرّ خود رہی نہ ہو

یوں زندگی گذار رہا ہوں چمن سے دور
جیسے کوئی غریب ہو اپنے وطن سے دور

کب ہے ترا خیال دلِ پُرمحن سے دور
بیٹھا ہوں تیرے پاس، تری انجمن سے دور

تجھ سے نظر ملاؤں دمِ شرحِ حال کیا
یہ بات ہے سلیقۂ عرضِ سخن سے دور

سلجھے ہوئے ہیں اب مرے دل کے تصورات
اب ہے خیالِ زلف شکن در شکن سے دور

اے انقلاب، یہ کوئی آئینِ جبر ہے
شیریں کی قبر ہے لحدِ کوہکن سے دور

رہتا ہوں آشیاں کے نئے اہتمام میں
میں تو خزاں میں بھی نہیں رہتا چمن سے دور

شکوہ ہے حسن کے ستمِ گاہ گاہ پر
ہے یہ شعار عشق و وفا کے چلن سے دور

تنکے نہ باغ میں ہے نہ ہے سبزہ زار میں
اب گھر کہیں بنائیے شہر و دمن سے دور

سادہ سے پیرہن کے بھی ٹکڑے اڑا دئے
دستِ جنوں رہا نہ لحد میں کفن سے دور

منظور اگر نہیں ہے جلانا تو جلد آ
اب دل کی آگ ورنہ نہیں پیرہن سے دور

اس میں خودی ہے دستِ خدا کی بھری ہوئی
انسان کیا رہیگا بھلا ما و من سے دور

وابستہ کائناتِ اسیری ہے باغ سے
ورنہ قفس، قفس نہیں رہتا چمن سے دور

نیرؔ وطن سے اب کہیں جانا روا نہیں
تا دیر زندگی میں رہے ہو وطن سے دور

یہ جاں نواز ہے یا جاں ستاں نہیں معلوم
ابھی تمھیں مرا دردِ نہاں نہیں معلوم

ہنوز انھیں بھی مری داستاں نہیں معلوم
کس انتظار میں ہے رازداں نہیں معلوم

قفس سے چھوٹ کے کہاں جائیں اب اسیرِ بہار
کوئی گھر اور نہ آشیاں نہیں معلوم

ہیں دل کے سوز کو پہلو میں ہم دبائے ہوئے
کہاں پھٹے گا یہ آتش فشاں نہیں معلوم

براہ راست جو چھوتی ہے روح کے پردے
ابھی وہ لے ہی تجھے نغمہ خواں نہیں معلوم

ہیں بے شمار مہ و مہر خاک میں پنہاں
زمیں کی قدر تجھے آسماں نہیں معلوم

چمک رہی ہیں ابھی بجلیاں چمن کی طرف
بچا کہ خاک ہوا آشیاں نہیں معلوم

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا کی خبر
کہاں سے آئے چلے ہیں کہاں نہیں معلوم

ہر ایک پیڑ ہر ایک پھول پہ گری بجلی
تباہ کیوں نہ ہوا باغباں نہیں معلوم

سرشتِ حسن بدستور ہے نشاط انگیز
مزاجِ عشق ہے کیوں سرگراں نہیں معلوم

رہی بہار و خزاں کے لئے ہوں سرگشتہ
جنھیں ملی بہار و خزاں نہیں معلوم

جو اس میں کیف ہے اے مردہ دل تو کیا جانے
تجھے حیات کی دلچسپیاں نہیں معلوم

یہ بجلیاں کچھ اس انداز سے چمکتی ہیں
کہ جیسے ان کو مرا آشیاں نہیں معلوم

نباہ کر نہ سکے ہستی و عدم نیرؔ
ہمیں پناہ ملے گی کہاں نہیں معلوم

مژدہ چشم شوق جذبِ شوق کام آ ہی گیا
تھا جو مقصودِ نظر بالائے بام آ ہی گیا

مجھ کو ساقی نے جو دیکھا تشنہ کام آ ہی گیا
لیکے آنکھوں میں شرابِ لالہ فام آ ہی گیا

دل میسّر ہو گیا تو خونِ دل کی کیا کمی
اب شرابِ ناب بھی آتی ہے جام آ ہی گیا

آنکھ سے ٹپکا کے خوش ہوں قطرۂ خونِ جگر
جیسے میری گود میں ماہِ تمام آ ہی گیا

ذکر تھا اہلِ وفا کا آج بزمِ حسن میں
بے تحاشا اُن کے لب پہ میرا نام آ ہی گیا

کام آئی جذبۂ شوقِ شہادت کی کشش
کھینچ کر آخر وہ تیغِ بے نیام آ ہی گیا

نزع کی دشواریاں دم بھر میں آساں ہو گئیں
نیّر اُن کا نام آخر بھی کام آ ہی گیا

ہوتی نہیں خوشی غمِ اُلفت کئے بغیر
دل مانتا نہیں ہے محبت کئے بغیر

طاعت گزیں ہوں کوششِ طاعت کئے بغیر
کرتا ہوں سجدہ سجدہ کی نیّت کئے بغیر

ہر چند شکوہ رسمِ محبت میں کفر ہے
چارہ نہیں ہے اُن سے شکایت کئے بغیر

میں جانتا ہوں جوشِ یہ رحمت میں آئے گا
دو چار نذرِ اشکِ ندامت کئے بغیر

ناصح مرے مزاج سے واقف تو ہے مگر
آتا نہیں ہے چین نصیحت کئے بغیر

اصرار ہے یگانگتِ عشق میں حرام
جو دیجئے وہ دیجئے حجت کئے بغیر

وہ آئے اور بعدِ عیادت چلے گئے
اندازۂ سکونِ طبیعت کئے بغیر

عرفانِ دل مجھے کسی صورت نہ ہو سکا
دل کو شریکِ دردِ محبت کئے بغیر

کیوں داغ ہائے دل سے نہ ہو مطمئن نظر
دولت ملی ہے خواہشِ دولت کئے بغیر

انسانیت نہ آئے گی انسان میں کبھی
وابستگیٔ عشق و محبت کئے بغیر

نیّر جہانِ عشق میں ہے زندگی محال
ترکِ خیالِ مذہب و ملت کئے بغیر

نشترؔ:-

نام قاضی حافظ الدین احمد مقتدری۔ نشترؔ تخلص۔ قاضی نجم صاحب برقؔ مرحوم کے پوتے اور منشی حیات بخش صاحب رساؔ مصاحب دربار رامپور اور جانشین حضرت نواب فصیح الملک داغؔ کے بھانجے ہیں خاندان چشتیہ اور قادریہ میں مولانا شاہ عبد المقتدر بدایوں سے بیعت ہیں، نعت المنقبت کا ایک دیوان زیر طبع ہے، جام و مینا خمریات کہ جو قطعات و رباعیات کا مجموعہ ہے طبع ہو چکا ہے۔ کلی اور انجام دو ناول طبع ہو چکے ہیں سکندر آباد وطن ہے اور خاندان فضا کے ایک فرد ہیں۔

جہاں چمن میں آباد ایک معصوم بستی ہے
یہاں آٹھوں پہر اللہ کی رحمت برستی ہے

بہار اس سرزمیں پر مستیوں کے راگ گاتی ہے
محبت پیار کرتی ہے صبا لوری سناتی ہے

یہ بستی میٹھے میٹھے نیند کے جب سانس لیتی ہے
نسیم صبح رخ پر اپنا آنچل ڈال دیتی ہے

یہاں جب صبحدم معصوم کلیاں مسکراتی ہیں
فضائیں شادمانی کا پھریرا لہلہاتی ہیں

فرشتے آسماں سے پاسباں بنکر اترتے ہیں
ستارے رات بھر ان کے رخوں پر نور بھرتے ہیں

اسی گلشن میں حوریں سانس لیتی ہیں جوانی کے
یہیں نشو و نما پاتے ہیں پودے زندگانی کے

اسی بستی کو عرشی جنت الفردوس کہتے ہیں
حسیں پیکر یہیں معصومیت کے آکے رہتے ہیں

قریب اس پاک بستی کے حسیں ایک اور بستی ہے
یہاں رنگیں نوائی ہے یہاں مستی ہی مستی ہے

محبت کی شریعت میں جوانی نام ہے اس کا
محبت زندگی ہے کیف و مستی کام ہے اس کا

یہاں کا ذرہ ذرہ حسن بنکر جگمگاتا ہے
محبت کی زباں میں اپنا افسانہ سناتا ہے

نگاہیں حسن کی اٹھ اٹھ کے اسکا دل لبھاتی ہیں
چھلک اٹھتا ہے سینہ آرزوئیں مسکراتی ہیں

نظام رنگ و بو قایم ہے اس کے لالہ زاروں میں
مچلتی ہیں ہزاروں حسرتیں اس کی بہاروں میں

یہاں جب دور چلتے ہیں شرابِ ارغوانی کے
مگر اس گلکدہ میں ایک نئی ایجاد ہوتی ہے
ہزاروں مشکلیں گرد اس کے گھیرا ڈال دیتی ہیں
جہنم بن کے یہ فردوس بالآخر ڈراتی ہے

فرشتے آکے بازو تھام لیتے ہیں جوانی کے
حواس و ہوش کی جس سے فضا برباد ہوتی ہے
یہاں راتیں گنہگاری کا ڈیرا ڈال دیتی ہیں
یہ کشتی اس حسیں طوفاں میں گھر کر ڈوب جاتی ہے

کنارے اس حسیں دنیا کے اور آباد ہے دنیا
یہیں پہ آ کے رشتہ ٹوٹتا ہے زندگانی کا
یہاں آکر عدم آباد کی راہیں نکلتی ہیں

یہ دنیا غم کی دنیا سر بسر فریاد ہے دنیا
اسے کہتے ہیں پیری دورِ آخر ہے جوانی کا
یہاں کی رہنے والی ہستیاں کاندھوں پہ چلتی ہیں

زمیں والوں کا ہو غماز رنگِ آسماں کب تک
حدودِ ظاہری میں ہیں تری دلچسپیاں کب تک
سلامت گردشیں ہیں تو نشانِ رفتگاں کب تک
گزر جا کاروانِ ہستیِ فانی سے بھی غافل
بنائے مستقل سے ناز کو پامال ہونا ہے
نشیمن سوزیوں میں بھی چمن کا پاس لازم ہے
مٹا دینی ہے حسن و عشق کی تفریق بھی اک دن
دو عالم کی حدیں معلوم لیکن دیکھنا یہ ہے
جوانی کھو کے اب پیری کا غم بے سود ہے نشتر

شفق افسانۂ جورِ بتاں کی سرخیاں کب تک
حقیقت بیں نگاہیں ہیں تو سعیِ رائیگاں کب تک
رہیں گے یہ مرقعے عبرت افزائے جہاں کب تک
کہاں بیداریوں میں لذتِ خوابِ گراں کب تک
سلامت ہیں مرے سجدے تو سنگِ آستاں کب تک
چراغِ برق سے روشن رہیگا آشیاں کب تک
نیاز و ناز کے پردے رہینگے درمیاں کب تک
مرے قالب میں رہتا ہے ترا امرِ نہاں کب تک
چھٹا جب کارواں ہم سے تو گردِ کارواں کب تک

لمحہ لمحہ خود کو سرگرمِ سفر پاتا ہوں میں
اپنی ہستی کو چراغِ رہگذر پاتا ہوں میں

ہے فروغِ حُسن بھی جذبِ کمالِ عاشقی
تیرے جلووں کو بھی اپنی ہی نظر پاتا ہوں میں

میری ناکامی سے قائم ہے غرورِ بے نیاز
ورنہ ہر ایک آہ شایانِ اثر پاتا ہوں میں

میرے ذوقِ بندگی کا اللہ اللہ احترام
جس طرف جاتا ہوں اُنکا سنگِ در پاتا ہوں میں

کس توقع پر ہو تکمیلِ محبّت کا خیال
لن ترانی زندگی کو مختصر پاتا ہوں میں

بنیاد رکھ کے ہم نے دُنیائے رنگ و بُو کی
ایک شاہراہ کھولی خود اپنی جستجو کی

تفسیر ہے بس اتنی دنیائے رنگ و بُو کی
ایک آئینہ میں لاکھوں شکلیں ہیں آرزو کی

آگے نکل گئے ہم ہستی کی جب حدوں سے
سمجھے کہ زندگی بھر اپنی ہی جستجو کی

دِل کو سمجھ رہے تھے ایک محشرِ تمنّا
دامن پہ جب نظر کی ایک بوند تھی لہو کی

باعثِ بربادیِ گلشن ہے طوفانِ بہار
آتشِ گل سے پُھنکا جاتا ہے دامانِ بہار

ہر قدم فکرِ قفس، ہر لحظہ ارمانِ بہار
کیا قیامت ہو گیا احساسِ عرفانِ بہار

سینہ زخمی - دِل سراپا داغ - آنکھیں خونچکاں
زندگی کا راز لکھتا ہوں بہ عنوانِ بہار

حُسن نے بدلا ترے، گلزارِ عالم کا مزاج
اب خزاں بھی آئی ہے ہم رنگ و ہم شانِ بہار

بڑھتے بڑھتے ضعف سامانِ قضا ہونے لگا
سانس کا کھٹکا ہر ایک بانگِ درا ہونے لگا

دل نے آخر خون ہو ہو کر جگہ آنکھوں میں لی
اشکِ غم عنوانِ رودادِ وفا ہونے لگا

درد نے مستغنیٔ ہر راحت و غم کر دیا
اب میں اپنا آپ ہی حاجت روا ہونے لگا

اک نگاہِ برق وش وہ ڈال کر چلتے ہوئے — یہ نہ دیکھا عشق کی دنیا میں کیا ہونے لگا
میرے سوزِ عشق سے روشن ہے پروانوں کی خاک — میری سرد آہوں سے بجھ جاتی ہے شمعِ انجمن
اٹھ کے منہ دھوتی ہے ہر ذرّہ کا موجِ مضطرب — جب نہانے آتی ہے خورشید کی پہلی کرن
وہ بھی نشتر ایک افسانہ ہے میرے عشق کا — جس حقیقت پر مرے جلتے ہیں شیخ و برہمن

دیکھ کر تشنہ مرے دل کی تسلی کر دی — جیسے خوشتر مے دی، پُرکیف دی، بہتر دی
منکشف ہو گئے دو گھونٹ میں اسرارِ حیات — آج ساقی نے مرے جام میں دنیا بھر دی

گردشِ ارض و سما گردشِ پیمانہ ہے — انقلابات نہیں لغزشِ مستانہ ہے
میری نظروں میں ہے ہر چیز سراپا مستی — لوگ دنیا جسے کہتے ہیں وہ میخانہ ہے

ترکِ مے کرتے نہ پھر شیخ ہوس گل کرتے — مانتا ساقی سے جو کچھ اُس پہ توکل کرتے
نہ کہا ایک بھی میکش نے ہو اللہ احد — ہو گیا خشک گلا مینا کا قُل قُل کرتے

سیکھ کر طاعتِ مقبول کے راز آیا ہوں — آج میخانہ سے باسوز و گداز آیا ہوں
نور برسے مرے چہرہ پہ نہ کیوں اے واعظ — پڑھ کے ہیں دامنِ ساقی پہ نماز آیا ہوں

قاضی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ صہبا ہے حرام — اور مفتی کا یہ فتویٰ ہے کہ نشہ ہے حرام
وجد میں دونوں ہیں ساقی سے ملا کر آنکھیں — ایسی مل جائے تو واللہ نہ پینا ہے حرام

مآلِ زندگی جب رات نے دنیا کو سمجھایا
گلوں نے ڈر کے کانٹوں پر جھکا دی اپنی پیشانی

حقیقت ڈوبتے تاروں نے کھولی عیشِ فانی کی
عطا کی گریۂ شبنم نے ہر ذرّہ کو تابانی

ماہرالقادری

منظور حسین نام ماہر تخلص، قادری خاندان سے نسبت بیعت حاصل ہے، پیدائش ۱۳۲۴ھ مولد و منشا کسیر کلاں ضلع بلند شہر، والد کا نام محمد معشوق علی جو ظریف تخلص کرتے تھے مگر اُنکی شاعری سنجیدہ انداز کی تھی، آخر میں صرف نعت کہتے تھے۔

ماہر نے تقریباً تیرہ ۱۳ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، شاعری میں وہ کسی سے نسبت تلمذ نہیں رکھتا ماہر کی نگاہ میں وجدان صحیح اور فطرت ہی رہنما ہے۔

ماہر القادری کا تقریباً بارہ سال تک حیدرآباد دکن میں قیام رہا، وہاں کے وزیر اعظم سر مہاراجہ کشن بہادر یمین السلطنت اُس کے قدر دان تھے، ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمت کا تعلق بھی ہو گیا تھا مگر ماہر کی آزاد طبیعت اس پابندی کو زیادہ دن تک گوارا نہ کر سکی چند دن فلمی دنیا سے بھی تعلق رہا اور وہاں منفعت کے بہت سے زریں مواقع حاصل تھے لیکن مذہبی احساس نے اُس ماحول سے سازباز نہ کرنے دیا، چنانچہ ماہر فلمی دنیا سے بھی بھاگ کھڑا ہوا۔

اب ماہر القادری دہلی میں مقیم ہے، نظم اور نثر کی پندرہ تصانیف شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں، بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں ماہر القادری نے عراق کا سفر کیا اور وہاں کے بادشاہ اور دوسرے عمائد سے ملاقات کی، ماہر القادری کی زندگی کا محبوب ترین شغل "مطالعہ" ہے اُس کے شعر و فکر کی تہ میں مطالعہ فکر و نظر کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔

ترا یہ نازِ تغافل سلام کے بعد	اب اور کیا ہے ارادہ اس انتقام کے بعد
سینہ وکہکشاں کا شق ہو جائے	سورج کی جبیں عرق عرق ہو جائے
انسان کا غم اگر ظاہر ہو	تنظیم جہاں ورق ورق ہو جائے

دوسروں کے منہ کی تعریفوں سے دل ہوتا ہے خوش
جبکہ ہو خود ذات پر اپنی کسی کو اعتماد
ہے امیروں کے یہاں اُنکے ندیموں کا یہ حال
جیسے سازندے طوائف کو دیا کرتے ہیں داد

کتنے غریب گھر ہیں اُجالے سے دُور دُور
جتنی بھی روشنی ہو ستاروں سے چھین لوں
دہقاں کے کھیت فصل میں بھی ہیں خزاں نصیب
رعنائیاں تمام بہاروں سے چھین لوں
اتنی تو کم سے کم ہوں مری جرأتیں بلند
شاہوں کے تاج صرف اشاروں سے چھین لوں
سردی سے کتنے جسم ہیں بیگانۂ لباس
جتنی بھی چادریں ہیں مزاروں سے چھین لوں

کششِ حسرتِ دیدار کہاں سے لاؤں
مستیٔ نرگسِ بیمار کہاں سے لاؤں
حسنِ رنگینیٔ افکار کہاں سے لاؤں
اب میں وہ نطقِ گہربار کہاں سے لاؤں
وقت نے چھین لیا ساقِ بلوریں سے گداز
اب میں وہ شوخیٔ رفتار کہاں سے لاؤں
اَب نہ آنکھوں میں چمک اور نہ عارض میں دمک
آہ وہ بارشِ انوار کہاں سے لاؤں
ہائے! وہ جوشِ جوانی وہ اُمنگوں کی بہار
اَب میں وہ دولتِ بیدار کہاں سے لاؤں
چشمِ میگوں ہے کہ ویران نظر آتی ہے
حاصلِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں
دِل میں گرمی نہ رہی شوق میں تیزی نہ رہی
شعلۂ آتشِ رخسار کہاں سے لاؤں
وہ تبسم کی جھلک ہے نہ وہ ابرو کی چمک
اَب میں چلتی ہوئی تلوار کہاں سے لاؤں
اَب نہ وہ زخمۂ مضراب نہ جذبات کا ساز
اثرِ نغمۂ کہسار کہاں سے لاؤں
نہ وہ شوخی، نہ لچک، نہ وہ اندازِ خرام
اب میں پازیب کی جھنکار کہاں سے لاؤں
جس نے کچھ روز زمانہ میں خدائی کی ہے
آج وہ حسن کا پندار کہاں سے لاؤں

ابھی ہے ہم حقیقت سے چراغِ صبح بیگانہ
کہ سوزِ عشق گردش میں ہے پروانہ بہ پروانہ

سازِ دِل جب شبِ فرقت میں صدا دیتا ہے
کوئی آواز میں آواز ملا دیتا ہے

میری نگاہِ شوق کو اُنکی نگاہِ شوخ سے ——— پاس کی نسبتیں بھی ہیں دور کا واسطہ بھی ہے

اے بُلبلِ خوش رنگ و خوش آواز مری سُن ——— نغمے جو ہوں بے کیف تو بجاتے ہیں نالے

عارض کی سرخیوں میں جھلکتی ہوئی حیا ——— لوگوں کو دیکھنے کی شکایت لئے ہوئے

آپ مجھ کو مل گئے کیوں زندگی کے موڑ پہ ——— اور وہ بھی اس طرح ملتے ہی کترانے لگے

جنوں کے آثار ہیں نمایاں بہار کا آگیا زمانہ ——— خرد سے تم مشورہ نہ کرنا تراش دیگی کوئی بہانہ

منزلِ دوست نہیں، رہگذرِ عام ابھی ——— سیر کرنے کو نہ آئیں سحر و شام ابھی

اسی رستہ سے گیا ہے بُتِ خود کام ابھی ——— میں نے دیکھی تھی نہیں گردشِ ایام ابھی

اُن کی رفتار کی ہم نے تو یہ صورت دیکھی ——— چال کی چال قیامت کی قیامت دیکھی

خدا کے واسطے کر داغِ آرزو کی قدر ——— کہ ظلمتوں میں یہی سورج کہیں نکلتا ہے

فروغِ مہر بھی دیکھا نمودِ گلشن بھی ——— تمہارے سامنے کس کا چراغ جلتا ہے

ہر نظر لطفِ تجلی، ہر نفس پیغامِ دوست ——— ایسے عالم میں ہے کس کو فرصتِ آوارگی

اس جہاں میں ہر کوئی کرتا ہے منہ دیکھی کا پیار ——— شمع کے بجھتے ہی پروانے بھی رخصت ہو گئے

مرے عزمِ سجدہ کی سادگی ہے تمام حاصلِ بندگی ——— کہ ابھی سے بابِ قبول کو کبھی التجا کی تلاش ہے

مجھ کو بھی خود یقیں نہیں شوق نے کیسے طے کئے ——— غم کے ہزار مرحلے ہجر کی ایک رات میں

کبھی نگہ تری بیگانگی سے تھا مجھ کو ——— جواب ہوئی ہے توجہ تو اِک قیامت ہے

محبت میں خیال و فکر بھی اپنے نہیں رہتے ——— وہ قائل ہیں مگر ہم اُن کو جانِ دل سمجھتے ہیں

بے حجابانہ توجہ، بے تکلف التفات ——— اس نے آخر نازو تمکیں توڑ دی میرے لئے

قدم اٹھتے ہی بڑھ جاتی ہے منزل ——— لہٰذا ہر فاصلہ کم ہو رہا ہے

جوابِ خط پہ وہ غورِ مسلسل ——— لکھے ہیں سی بنا کر رہ دے گئے ہیں

آدمی واقفِ اسرار نہ ہونے پائے
زندگی خواب سے بیدار نہ ہونے پائے

صبحِ فردا ترے بیمار پہ ہوگی نہ طلوع
کاروانِ غمِ امروز کدھر جائے گا

یہ چہرہ بے رنگ یہ ویران نگاہیں
اے دوست مرے غم کو شکایت نہ سمجھنا

تم آگئے زہے قسمت تمہاری عمر دراز
تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

حسن اور نفرتیں محبت کی
ہائے! تو نے یہ کیا کیا اے دوست

میں تری یاد کو اے دوست دعا دیتا ہوں
زندگی غم میں بھی راحت سے بسر ہوتی ہے

نقاب اٹھتے ہی بیگانہ ہوگئیں نظریں
مری نگاہ نے جلووں سے انتقام لیا

احساسِ خوشی مٹ جاتی ہے، افسردہ طبیعت ہوتی ہے
دِل پہ وہ گھڑی بھی آتی ہے جب غم کی ضرورت ہوتی ہے

آنکھ میں آنسو لب پہ خوشی
دِل کی بات اب راز کہاں ہے

نخشب جارچوی

نخشب جارچوی صاحب دیوان نوجوان خوش بیان و صبیح الشکل انسان ہیں، عمر تخمیناً تیس سال آج کل فلم میں گانے (سیٹ) کر رہے ہیں۔

مری کشتی سے موجوں کو نرالا کھیل سوجھا ہے
کہ ہر جنبش پہ اس کو دور کر دیتی ہے ساحل سے

ہوگئی بزم منتشر ہم ہیں کچھ ایسے بے خبر
جیسے ہمارے واسطے ان کا پیام اور ہے

آپ تو گھبرا گئے بیتابیٔ دل دیکھ کر
کیا کہیں گے پردہ پر در اہلِ محفل دیکھ کر

ہیں پائمالِ گردشِ ہفت آسماں سہی
لیکن مٹا ہوں تیری تمنا لئے ہوئے

اٹھلانے والے یہ اک بات ہے بتانے کی
جبینِ شوق سے زینت تھی آستانے کی

کسی طرح بھی وہ دل سے جدا نہیں ہوتے　　ہزار طرح سے ان کو بھلا کے دیکھ لیا
وہ آنے والے زمانے کو کیا مٹائے گا　　جو آج تک مرے ماضی کو حال کر نہ سکا

نظر والے شریکِ جلوہ گاہِ طور ہوتے ہیں　　کہ ہر محفل کے دنیا میں الگ دستور ہوتے ہیں
سیہ بختی میں ہم رنگی ہی شاید کچھ سکوں بخشے　　ترے مہماں ہم بھی اے شبِ دیجور ہوتے ہیں

شکووں نے لیں پناہیں دامانِ خامشی میں　　اس نے مزاج پوچھا لیکن روا روی میں
کچھ بھی حقیقتاً بھی ان سے مجھے شکایت　　کچھ بات چھڑ گئی تھی یوں ہی ہنسی ہنسی میں

کیا ہو جنونِ شوق کا انجام دیکھئے　　خود حسن بھی ہے لرزہ بر اندام دیکھئے

آپ کے دل کا بھی جواب نہ تھا　　اس میں گر میری یاد بھی ہوتی
رابطہ باطنی بجا ہی لیکن　　کچھ تو تسکین ظاہری ہوتی
اس حضوری سے فائدہ کیا تھا　　بات جب تھی کہ بات بھی ہوتی

دیکھتے ہی ہوش رخصت ہو گئے اچھا ہوا　　ورنہ کیسے دل کی بربادی کا منظر دیکھتے

مجھے مجاز پہ دھوکا ہوا حقیقت کا　　میں خواب کو یہ سمجھتا رہا کہ خواب نہیں

احترامِ حسنِ خود بیں کا تقاضا تھا یہی　　باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر سے دیکھتے

حسن کی فطرت میں ضد ہے آزمائے جائیے　　یاد آئے گی انہیں جتنا بھلائے جائیے
آج تک تب جان دیکھ نقشِ پائے دوست پر　　یہ جو اک پردہ ہے اس کو بھی اٹھائے جائیے

سارا میخانہ کا میخانہ نہیں تھوڑی سی　　آپ کہہ دیتے تو پی لیتے ہمیں تھوڑی سی
ساقیِ بزمِ ازل تیری سخاوت کے نثار　　ہم بلا نوش بھی پیتے ہیں کہیں تھوڑی سی

کچھ آج چل رہی ہیں بہکی ہوئی ہوائیں　　آثار کہہ رہے ہیں ممکن ہے وہ بھی آئیں
دل پہ نہیں تو اتنا قابو ہو حافظہ پر　　جو چاہیں یاد رکھیں جو چاہیں بھول جائیں

جوش میں آئے تو دامن کی اڑا دیں دھجیاں — ہوش میں آئے تو کانٹوں سے رفو کرتے رہے
کہنے والا کہہ گیا وہ ہچکیوں میں رازِ غم — سننے والے مدتوں تک گفتگو کرتے رہے

دیدۂ و دل نے متفق ہو کے مٹا دی کائنات — اور جہاں عشق میں اپنوں کا اعتبار گیا

ابھی تو رابطے کے آثار پائے جاتے ہیں — خیال ہی میں سہی پر وہ آئے جاتے ہیں
وہ آئے ہیں نہ کبھی آئینگے یقیں ہے مگر — ہم اپنی بزمِ تصور سجائے جاتے ہیں

یہاں تک احتیاطِ شوق بڑھی ہے کہ اب ڈر ہے — یہ بیگانہ روی غمازِ رازِ دل نہ بن جائے

وعدے کا اعتبار تو ہے واقعی مجھے — یہ اور بات ہے کہ ہنسی آگئی مجھے

خلش کے ساتھ تڑپ ہے تڑپ کے ساتھ خلش — ہمارے ظاہر و باطن میں امتیاز نہیں

بڑھتی رہی خلش مجھے احساس بھی رہا — الفت بقیدِ ہوش زِ جذبہ کام کر گئی
وہ تو شریکِ جلوہ گہِ ناز ہو چکا — جس پر ادائے پردہ در کام کر گئی
نخشب مآلِ گریۂ پیہم کرم ہوا — یا سادگیِ دیدۂ تر کام کر گئی

تیرے در سے اٹھ کر کمی پا رہا ہوں — خدا جانے کیا شے رہی جا رہی ہے

کرم آمیز نظروں نے عجب نشو و نما بخشی — ہوئے اتنے ہی پیدا دل میں ارمان جس قدر نکلے

حضوری میں تو دوری سے بھی زیادہ دل دھڑکتا ہے — کسی صورت سے حل ہو بھی گئی مشکل تو کیا ہوگا

اشارہ کیا محبت کی تو نظریں بھی نہیں چھپتیں — ہمارا رازِ دل محفل میں رازِ دل تو کیا ہوگا

جلوے نگاہِ شوق سے ٹکرا کے رہ گئے — یوں سامنے وہ آئے کہ شرما کے رہ گئے
دل کا ہجومِ یاس میں عالم نہ پوچھیے — کیا کیا خیال ذہن میں آ آ کے رہ گئے

نظر میں وسعتیں تلووں میں کانٹے خاک بالوں میں — ترا دیوانہ اپنے ساتھ لے آیا بیاباں کو
چھپائیں کتنا ہی نخشب اسے دل میں مگر پھر بھی — وہ نظریں گدگدا کر پوچھ لینگی رازِ پنہاں کو

ایسے ہیں کہیں اپنے پرائے کا گلا کیا — اک سانس کا پردہ ہی فنا کیا ہے بقا کیا
کیا حسن میں شامل ہی نہیں عشق کے پہلو — اتنا یہ بتا دو کہ میں حسن کے ہیں رہا کیا؟
یہ طعن ہے کہ چھپ نہ سکا رازِ محبت — تم نے بھی تو جلوہ کو چھپایا تھا چھپا کیا؟

کوئی کس طرح رازِ الفت چھپائے — نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے
وہ مجبوریوں پہ مری مسکرائے — یہاں تک تو پہونچے یہاں تک تو آئے
وہ اس طرح میرے برابر سے گزرے — ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے
تو غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتا — بہت اشک روکے بہت مسکرائے
میں اس احتیاطِ نظر کے تصدق — نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

احتیاطِ شوق و ضبطِ آرزو کے باوجود — مجھ پہ جو گزرے گی ان کو بھی خبر ہو جائے گی

آپکے دامن سے وابستہ ہے میری زندگی — آپ جس عالم میں جائیں گے بسر ہو جائے گی
شکوہ تو کرتا مگر یہی نظر کا کیا جواب — آہ لب تک آتے آتے بے اثر ہو جائے گی
آپ میری جانب نظر ہے جب میں دیکھوں گا ادھر — وہ نظر گھبرا کے صرفِ بام و در ہو جائے گی

شاقی تھے التفاتِ زیبِ جمال ہے — یہ جان کر بھی خود کو چھپایا نہ جا سکا
یہ بھی ہے سچ کہ دیکھ نہ سکے جمالِ دوست — یہ بھی ہے واقعہ کہ دکھایا نہ جا سکا

اشارۃً بھی نہ شکوے بیاں کئے ہوتے — سیئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے

"گنگا کے کنارے" پانی میں ہے جس طرح ہر دو پاٹ جمنائی — جیسے کوئی بھڑکے ہوئے شعلوں کو بجھائے

"معلم چمن" گلشن کو مل گیا ہے کھویا ہوا خزینہ — نرگس کی کوری آنکھیں پھر ہو گئی ہیں بینا

"طلوع سحر" ہے دھندلکا جہاں پر طاری — پھر کے چلتی ہے نبضِ بیداری
شب نے الٹا ہے سرمئی آنچل — چشمِ گردوں سے چھٹ گیا کاجل

اک خلا سا ہے شب کے سینے میں — نور ہے رات کے سفینے میں
چھپ گئے آسمان پر تارے — داغ سینے کے ڈھل گئے سارے
کروٹیں لے کے طرد طرا اٹھے — آنکھ ملتے ہوئے شجر اٹھے

پریت نگر کی ریت یہی ہے جو کھوئے سو پائے
آشاؤں کے جھولے بنا کر پریم کی پینگ بڑھا
اس کے دل میں اپنا گھر کر اس کو من میں بسا
پھر کیوں من میں ہوک اٹھت ہے پھر کیوں یاد ستائے
پریت نگر کی ریت یہی ہے جو کھوئے سو پائے
کوکو کی اس دھن میں کوئل بھیج رہی سندیس
بیری پپیہا پی کو پکارے پیا گئے پردیس
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے، کون کسے سمجھائے
پریت نگر کی ریت یہی ہے جو کھوئے سو پائے

طالب

طالب صاحب کی کہانی خود ان کی زبانی سنئے:۔

طالب تخلص، عبد الرّب نام، فرزند وحید قاضی عبد القیوم صاحب انصاری مرحوم، تاریخ پیدائش ۱۰ ذی الحجہ یوم جمعہ وقت نماز عید الضحیٰ تقریباً نو بجے صبح مطابق ۱۳۱۵ھ مولد و موطن قصبہ جیور ضلع بلند شہر، تعلیم و تربیت وغیرہ لشکر ریاست گوالیار میں اپنے خاندانی بزرگوں سے پائی۔ ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونیکے بعد فن طبابت کے کورس کی کتابیں ختم کیں، مجالس سخن دوراں

...شرکت و حاضری کا شوق از بس کہ خاندان کے ہر فرد کو وہبی اور آبائی طور پر عطا ہوا ہے ...کو بھی بچپن سے ہی تھا۔ اس کے بعد "گونا" پہونچکر وہاں کی محفلوں کی بدولت اردو میں کہنا شروع کیا ...کلام ملاحظہ ہو

از تپش تا بے نیازم بے قرارے کیستم   دل تپد در سینہ من اضطرارے کیستم
...شب از غیرتِ تقصیرِ خود سوزم بہ عشق   عمر شد گریم کہ یارب شرمسارے کیستم
...خود آیم بہ سنگِ راہ اکثر سر زدہ   می کشم فریاد و نالہ دل فگارے کیستم
...ہزار افسانہ دارم بر زبانِ خوں چکاں   طالب از درد سے کہ می نالم ہزارے کیستم

...بہ ہزار عشوہ و ناز راحتِ جانِ کیستی؟   دارو ے درد و چارۂ سوزِ نہانِ کیستی؟
...کہ بہ عشوۂ و ادا کردی تہم زیر جدا   جاں بہ تو می کنم فدا تیغِ میانِ کیستی؟
...دل فزودۂ صبر و سکوں ربودۂ   بادِ وفا قرینِ تو نوکِ سنانِ کیستی؟
...حال شو کہ یار خستہ ات از نگاہ ناز   چیں بہ جبیں کُناں ہمہ تیر کمانِ کیستی؟
...از شرحِ سوزِ دل بزمِ سخن فروختہ   طالبِ سوختہ جگر شعلہ بیانِ کیستی؟

...و دردِ عاشقاں غافل و بے خبر مشو   غرۂ حسن اگر شوی اے صنم ایں قدر مشو!
...قاصداں سبز خود بہ یار نامہ بر   رازِ حبیب را مدہ ساعی و پردہ در مشو
...دیدہ دور شد دوری نہ دل ہمی شود   ترسم و مضطرم ازیں غائبم از نظر مشو
...گر قریب ترہم جگر سے مست بے جگر   تا بہ دلم کنی نظر بے خبر از جگر مشو
...راہ شوق را حاجتِ خضر راہ نیست   در پے کار خویش باش در پے راہ بر مشو

حیّ و رواں چو اشک باش در غمِ قدرِ خود مباش مرگِ ابد مکن تلاش آبلۂ گہر مشو
عشق و ہزار بدظنی حسن و رقابت افگنے زہرِ فریب خوردۂ مستیِ پیام تر مشو
طالب اگرچہ کردہ بیشتر عمر را تلف از سرِ عاقبت کنوں بے سر و بے حذر مشو

آں کہ از دردِ فراقش زار و گریانم توئی آں کہ در سوزِ نہانش سینہ بریانم توئی
آں کہ از نورِ جمالش دیدہ حیرانم توئی آں کہ در شوقِ وصالش مضطرب جانم توئی
باعثِ وحشت خرامی در بیابانم توئی وجہِ بخیہ کاریِ چاکِ گریبانم توئی
معنئے کز فکرِ او اندیشہ در دل خوں شود بر زباں شعرے شدہ تشریف ارزانم توئی
درس آموزِ فنا در حسرتِ وصلِ بقا یوسفِ مصرِ تصوّر ماہِ کنعانم توئی
حسرتِ دیرینہ دارم کہ مہمانت شوم در لباسِ حسرتِ دیرینہ مہمانم توئی
جلوہ آرائے تجلّی خانۂ غیب و شہود آئینہ دارِ وجوبِ خویش و امکانم توئی
ہم چو طالب متصل حیرانِ جلوت ہائے حسن در فضائے لامکانی بال افشانم توئی

وسوسے آتے نہیں یہ مردِ کامل کے قریب دور ہے منزل سے وہ یا ہے وہ منزل کے قریب
اپنی فطرت سے مگر مجبور ہے طالب ترا دور ہے منزل سے وہ خود رہ کے منزل کے قریب

اہلِ ذکرِ عیش سے ہوتا ہے دو تاریخ و غم اب کہ اگلی صحبتیں خوابِ پریشاں ہوگئیں
جس قدر تھیں شوخیاں طالب ترے اشعار میں خیر سے وقفِ نگاہِ نازنیناں ہوگئیں

دید کا ہے آج شاید اذنِ عام
حشر میں عشاق کا ہے اژدحام

یہہ تری جلوہ گری بالائے بام
اُف رے خورشیدِ قیامت اہتمام

عشق سرتاپا ہے اخلاص و نیاز
حسن ہر اک تیغِ نازِ بے نیام

دُعاؔ:۔

محمد مرتضی احسن نام۔ دؔعا تخلص۔ ڈبائی ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور حضرت نوؔح ناروی کے شاگرد رشید ہیں۔ پرگو اور مضمون آفریں ہیں، گوالیار ریلوے میں آفیسر سررشتہ ہیں، نظم اور غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔

اے ہند تیری سطوت و جبروت پر نثار
تو وہ ہے جس کے واسطے دنیا ہے بیقرار

سونے کی کان تجھ کو سمجھتے ہیں تاجدار
نادار ہو کے اہلِ دول میں ہے ذی وقار

تیرا ہی ظرف ہے یہہ تجھی میں کمال ہے
دشمن بھی تیرے سامنے آ کر نہال ہے

مآلِ لطف و کرم بعدِ مرگ یہ دیکھا
ہم آج خاک کے نیچے دبائے جاتے ہیں

زبانِ تیغ ادھر گل کھلائے جاتی ہے
دہانِ زخم ادھر مسکرائے جاتے ہیں

زمینِ نجد کے ذرات لے دعاؔ اب تک
ترانہ قیس کی الفت کا گائے جاتے ہیں

دلہن بنکر سنور جاتی ہے رنگِ خونِ بسمل سے
کوئی یہ سرخوشی سیکھے لے شمشیرِ قاتل سے

دھڑکتے ہی رہے ملتا ہے دل دنیا میں مشکل سے
اُدھر ان کی نظر اٹھی اِدھر دل ملگیا دل سے

وفا:-

مولوی حاجی حفظ الرحمٰن صاحب نام - وفا تخلص - ڈبائی کے باشندے ہیں اور مسلم یونیورسٹی میں کیشیر ہیں - مشاعروں کے انعقاد کا شوق اور تجربہ ہے، ان کا سفرنامہ حجاز اور فریاد دربارِ مصطفیٰ میں حال ہی میں طبع ہوئے ہیں، غزل میں اساتذہ کا عقیدتمندانہ تتبع فرماتے ہیں۔

دیکھ کر ہنستے ہیں کانٹے شانِ عریانی مری — اک تماشہ بن گئی ہے چاکِ دامانی مری
المدد اے جوشِ وحشت المدد دستِ جنوں — گم ہوئی جاتی ہے ذروں میں پریشانی مری
کر رہا ہوں یار کے قدموں پہ تکمیلِ وفا — ڈھل رہی ہے نور کے سانچے میں پیشانی مری

وہ بیخودی ہو کہ بادہ ہو کیف ہو کہ سرور — یہ سب تمھاری نگاہوں میں پائے جاتے ہیں
کرو نہ آن کے ستانے کا کچھ خیال وفا — وفا شعار ہمیشہ ستائے جاتے ہیں

کہاں جائینگے وہ بچکر حصارِ جذبِ کامل سے — وہ دل سے دور ہونے پر بھی گویا پاس ہیں دل کے

ذبیحی:-

حکیم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نام - ابوالمسعود کنیت اور عاشق ذبیحی تخلص فرماتے ہیں بزم ادب ڈبائی کے سکرٹری ہیں - عربی اور فارسی میں کچھ استعداد بہم پہنچائی ہے -

جلا سوزِ محبت نے وہ کی خاکسترِ دل سے — مصفّا ہو گیا آئینۂ جاں زنگِ باطل سے
مقامِ حسن اقرب طے ہوا ہے کیسی مشکل سے — دلِ ناداں بہت خوش تھا نویدِ قربِ منزل سے
فضائے سینۂ سوزاں بنی ہے وادیٔ ایمن — چمک اٹھتی ہے برقِ طور تھم تھم کر مرے دل سے
فضائے لامکاں بھی تھی اسے اک گوشۂ زنداں — ترا دیوانہ جب آزاد تھا قیدِ سلاسل سے
سنبھل جانا ذرا اے منظرِ ساحل کے متوالے — کہ موجیں بحرِ غم کی بڑھ چلی ہیں حدِ ساحل سے

لیتے ہیں چٹکیاں دلِ حسرت مآب میں
چھپتی نہیں وہ شوخ ادائیں نقاب میں

یارب ہمارے دل کی تمنا کدھر گئی
اپنے سوال میں ہے نہ اُن کے جواب میں

وارفتۂ مجاز نہ ہو اے نگاہِ شوق
نازاں ہے آفتاب کہاں طشتِ آب میں

پیغامِ مرگ جذبِ حقیقت کا نام ہے
دریا میں مل گیا تو رہا کیا حباب میں

رسوا:

منشی افتتاح الرحمٰن نام، رسوا تخلص ہے، احسن صاحب مارہروی کے شاگرد ہیں، وطن ڈبائی ہے اور مسلم یونیورسٹی بک ڈپو میں منیجر ہیں۔ کلام یہ ہے۔

اِک موجِ انقلاب بہا لے گئی اُسے
جتنی ہوا بھری تھی دماغِ حباب میں

ہے آہ پُر خلش مری موجِ نفس کے ساتھ
یا درد ہے بھرا ہوا تارِ رباب میں

اب وہ نہ شورشیں ہیں نہ وہ نالہ و بکا
کیا کہہ گئے وہ اپنے اسیروں سے خواب میں

دِل کی تڑپ کو دیکھ کے ہوتے ہیں مطمئن
لیکن میں دے رہا ہوں انھیں اضطراب میں

شیدا:

قاضی معین الدین شیدا ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء کو قصبہ جیور ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ منظور حسین تاریخی نام رکھا گیا۔ قاضی عزیز الدین رخشاں کی جائے ملازمت گوالیار آکر فارسی اور انگریزی کی تحصیل شروع کی۔ قاضی عزیز الدین رخشاں بزمِ ادب گوالیار کے سکریٹری تھے خوش گو تھے۔ رسا سکندر آبادی، وجاہت جھنجھانوی، احسان شاہجہانپوری، اور مضطر خیرآبادی، مقصود حسین حیرت شاگرد حضرت داغ اور دیگر اساتذہ سخن کے آجانے سے شعر و سخن کے چرچے بہت بڑھ گئے۔ اسلئے بارہ[۱۲] تیرہ[۱۳] برس کی عمر میں شعر کہنے لگے بعد میں حوادثاتِ زمانہ نے مشقِ سخن کا موقع کم دیا۔ شیدا کو فنی معلومات بہت اچھی ہیں۔ جب فکرِ سخن کرتے ہیں تو نوح کی عاید کردہ پابندیوں کے ساتھ۔

اک ذرا ٹھہرو سمجھنے دو ذرا دل سے مجھے
تم نے دنیا سے اٹھایا ہے کہ محفل سے مجھے

تم نے اپنا دل تو وقفِ عشقِ دشمن کر دیا
لو یہ میرا دل ہے اب چاہو مرے دل سے مجھے

اظہارِ غم کو شکوہ بجا سمجھ لیا
یہ تم نے کیا خیال کیا، کیا سمجھ لیا!

اب ناصح و رقیب و فلک ایک مد میں ہیں
ہم نے تو سب کو آپ ہی جیسا سمجھ لیا

مایوسیوں کی عشق میں کچھ انتہا نہیں
حد ہو گئی کہ غیر کو اپنا سمجھ لیا

اس حسنِ ظن کا حضرتِ دل کچھ علاج ہے
اک شوخِ جانستاں کو مسیحا سمجھ لیا

میں نے تو خیر غیر کو دشمن کیا خیال
تم نے تو اس کو چاہنے والا سمجھ لیا

شیدا کی ساری عمر تجسس میں کٹ گئی
لوگوں نے سہل ہی ترا ملنا سمجھ لیا

زندہ باش اے جوشِ وحشت اے جنونِ عمرت ساز
اب کہیں جی خوش ہوا ہے گھر کو صحرا دیکھ کر

آہ تم بھی دشمنِ اہلِ وفا ثابت ہوئے
اور میں نے دل دیا تھا حسبِ منشا دیکھ کر

کچھ سنا تم نے یہ کیا مشہور ہے افسانہ آج
مر گیا لے کر تمھارا نام اک دیوانہ آج!

لوگ میرے بعد قاتل سے کرینگے باز پرس
ختم ہو جائیگا کوئی آج کا افسانہ آج!

زلف شانوں پہ بکھرے ہوئے وہ پھرتے ہیں
چاہتے ہیں کوئی پابندِ سلاسل ہو جائے

محبت کا کچھ لطف دیکھا نہ میں نے اٹھایا نہ کچھ حظِّ عہدِ جوانی
ادھر رفتہ رفتہ شباب ان پہ آیا ادھر موت آئی مجھے ناگہانی

ترے کہنے سننے کا صیاد مجھ کو یقیں بھی جو آئے تو کس طرح آئے
جو دیکھا تھا میں نے شگافِ قفس سے وہی اب سنا ہے صبا کی زبانی

وہ رازِ محبت وہ سرمایۂ دل کٹی عمر حسرت چھپانے میں جس کے
مجھے ڈر ہے افشا نہ کر دے کسی پر مری آنکھ سے اشکِ غم کی روانی

ادھر ہے مجھے قتل ہونے کی حسرت انھیں اس طرف شوقِ مشقِ ستم ہے
مگر اپنی فطرت سے مجبور دونوں وہاں ہے نزاکت یہاں سخت جانی

آتشِ طور تو جل کر ہوئی کب کی ٹھنڈی
اس زمانہ میں برستی ہے ہر اک بام سے آگ

آگ ہی آگ برستی ہے زمانے بھر میں
کبھی اس بام سے برسی کبھی اس بام سے آگ

کچھ حیا کچھ غرور کی تصویر
ہے سراپا حضور کی تصویر

اُف مصوّر کی سحر قلم کاری!
کھینچ لی دور دور کی تصویر

جب نظر کارساز ہوتی ہے
وہ بڑی بے نیاز ہوتی ہے

چارہ گر اب ہاتھ بھی ان کو لگا سکتا نہیں
آبلے بیٹھے ہیں بن کر زخم پہ دربانِ زخم

رستے رستے زخم میرے ہو گئے ناسور بھی
وہ یہی کہتے رہے کرتے ہیں اب درمانِ زخم

رشک بھی اک چیز ہے دنیا میں او دشمن نواز!
کیا یہ منشا ہے کہ اُٹھ جائیں تری محفل سے ہم

ایک تم ہو کہ ہمارے لئے سب کچھ تم ہو
ایک ہم ہیں کہ تمھارے لئے ہم کچھ بھی نہیں؟

کیا قیامت ہے کہ ہے موقوف میری مرگ و زیست
آہ اک بدعہد کے اقرار پہ انکار پر

آگ ہی آگ ہے زمانے میں
سینۂ مشتعل کو کیا کہیے

دل بھی مجھے ملا غمِ دل بھی مجھے ملا
اللہ تیرا شکر کہ قسمت بُری نہیں

شیدا! غزل میں معنویت کچھ تو چاہیئے
الفاظ کی کشش تو کوئی شاعری نہیں

اِک ایسی شے بھی گلستاں میں پائی جاتی ہے
کہ برق جس کیلئے تلملائی جاتی ہے

راز سمجھو تو محبت راز ہے
حسن کا ورنہ کھلا اعجاز ہے

ہے اُن آنکھوں میں التفات کا رنگ
آج ہے اور کائنات کا رنگ

نزع میں آئے وہ عیادت کو
آگیا موت میں حیات کا رنگ

وہ تصور میں آنے والے ہیں
یا پلٹتا ہے کائنات کا رنگ؟
یہ حنا ہے کہ خونِ عاشق ہے؟
دیکھتے ہیں وہ اپنے ہاتھ کا رنگ

وہی جنوں، وہی دستِ جنوں، وہی دامن
رہی بہار تو کچھ دن میں آ ہی جاتی ہے
بیانِ حرمتِ مے تجھ سے کیا کروں واعظ!
یہ چیز وہ ہے کہ جنت میں پائی جاتی ہے

بات کیا ہے اے موسیٰ ہوش باختہ کیوں ہو؟
کیا کوئی حسیں دیکھا جلوہ گاہِ ایمن میں

تم کب آ گئے مریضِ غمِ ہجراں کے قریب
اب تو یہ درد پہونچنے کو ہے پایاں کے قریب
دیکھئے یہ تپشِ دل بھی نہ دیکھی ہوگی
ہاتھ لانا تو ذرا سینۂ سوزاں کے قریب

ہجر میں جی بہل نہیں سکتا
اس طرح کام چل نہیں سکتا
موت ٹالے سے ٹل بھی سکتی ہے
آپ کا حکم ٹل نہیں سکتا

گردشِ قسمت ہے ساقی اس کا نام
ہاتھ لگتے ہی الٹ جاتا ہے جام
شوقِ منزل دل میں ہونا چاہیئے
رہ نما کا ساتھ ہی کیا، چند گام
تجھ پہ ان باتوں سے اے واعظ کہیں
مے تو مے جنت نہ ہو جائے حرام
خیر ساقی محتسب کچھ بھی کہے
میرے منہ سے بھی سنا توبہ کا نام؟
آج تو ہم نے بھی شیدا کو سنا
ایسے کم گو اس قدر رنگیں کلام!

ہیں یہ آداب اُن کی بزمِ ناز کے
آنکھ اٹھا کر دیکھنا ٹھہرا گناہ

اگر تم باوفا ہوتے اگر میں بے وفا ہوتا
نظامِ حسن و اُلفت کس قدر بدلا ہوا ہوتا؟

جوشِ جنوں میں پھوڑ کے سر دیکھتا ہوں میں
دیوار دیکھتا ہوں نہ در دیکھتا ہوں میں

وفا کی داد ملتی ہے تو یوں قاتل سے ملتی ہے
چھری بن کر نگاہِ ناز میرے دل سے ملتی ہے

کس طرح تو واضح ہو قاتل تیرے پیکاں کی
اک دل تھا کیا صدقے اک جان تھی قرباں کی

تری نوازشِ پیہم نے کر دیا گستاخ — رقیب پہلے تو اتنا زباں دراز نہ تھا
بجا ہے مرے ہی دل کی تمام تر تھی خطا — ترا قصور تو کچھ او نگاہِ ناز نہ تھا

رہائی کون سی صیاد نے کہہ دی؟ — قفس میں ختم جب میعاد کر دی
جوانی حاصلِ صد زندگی تھی — جو میں نے عشق میں برباد کر دی

تجھے کیسے کہہ دیا ناصح! — تم مرے غم گسار ہو جانا
دل کا آشفتہ کار ہو جانا — آفتِ روزگار ہو جانا
وحشیوں کو ترے نوید بہار — پیرہن تار تار ہو جانا

خنجر سکندر آبادی

حکیم محمد سعید صاحب نام، خنجر تخلص۔ سکندر آباد وطن ہے، ایک عرصہ تک رسالہ "ید بیضا" کے ایڈیٹر رہے، مطب کرتے ہیں، عمر ۶۵ سال ہے، عرصہ ہوا شاعری ترک کر دی۔

بس کرو کل کے لئے بھی کچھ تو صلواتیں ہیں — ہو چکا غصہ چلو اب پیار کی باتیں ہیں
دل لیے جن سے اس ظالم کا وہ باتیں ہیں — چشم تر ہاں پھر جھڑی لگ جائے برساتیں ہیں

نشاں گر ڈھونڈھتے ہیں آپ یا کامِ الفت کے — مرقعے یاس و حسرت کے کھنچے ہونگے مزاروں میں
سحر آتے ہیں شام آتے ہیں اب آتے ہیں وہ آکے — دل بیتاب اب تک کھا رہا ہے اُن سہاروں میں
گلابی رنگ نکھرا ہے بلا کا فصلِ باراں میں — نہ ڈالے دخترِ رز تفرقہ پرہیزگاروں میں
گماں ہوتا ہے شاید دل گرفتوں کے یہ دل ہونگے — بہت سی بے کھلی کلیاں نظر آتی ہیں ہاروں میں

تابِ سخن ہے کس کو تری جلوہ گاہ میں — کھو جاتے ہیں حواس تو پہلے ہی راہ میں
کچھ ٹیس ہے جگر میں تو کچھ دل میں درد ہو — سچ پوچھئے تو لطف اسی کا ہے چاہ میں

کیسا جواب نامہ نہ بھیجی خبر ملی — قاصد غریب قتل ہوا کس گناہ میں
کہتے تو ہیں کہ ہوتا ہے نالے میں کچھ اثر — سنتے تو ہیں کہ ہوتی ہے تاثیر آہ میں

ندیم:

مشتاق احمد صاحب ندیم برنی۔ سلسلہ نسب مشہور مورخ ضیاء الدین برنی سے ملتا ہے۔ پہلے میونسپل بورڈ سکندرآباد میں ہیڈ کلرک تھے، اور اب خورجہ کی راشننگ میں اسی عہدہ پر ممتاز ہیں، وضع و قطع اور عادات و اطوار پر زہد اور تصوف کا رنگ ہے اور یہی رنگ کلام میں جھلکتا ہے۔

بنا ہے فصلِ گل میں دامنِ گل میرا داماں تھا — اڑا جو ہوئے گل بنکر مرا چاکِ گریباں تھا
کلیم اللہ کی مانند ہم کیوں طور پر جاتے — ہمارا داغِ پنہاں ہی چراغِ زیرِ داماں تھا
پہلو سے میرے لیگئے جب دل نکال کے — پھر کیوں نکالتے ہیں وہ پہلو ملال کے
شوریدگی ہے سر میں ہمارے جو آج کل — آنکھوں میں پھر رہے ہیں بیاباں نئے نئے
آرزو بر نہ آسکی دل کی — ہائے دل ہی میں رہ گئی دل کی
تیرے قدموں پہ دم نکل جائے — ہے تمنا بس اب یہی دل کی
ناز اُدھر مدعی اِدھر غمزہ — کشمکش میں ہے زندگی دل کی
خاصانِ حق کو دشمنِ حق سے نہیں گزند — آتش کدہ خلیل کے حق میں چمن بنا
یہ کون غیرتِ گل سیرِ چمن کو آیا — یہ اوس سی گلوں پہ کیوں پھر گئی چمن میں
اُس کو چلا ہے ڈھونڈھنے جس کا نشاں نہیں — ہمت تو دیکھئے دلِ خانہ خراب کی
ہوتا نیرنگِ جہاں یہ۔ نہ ہویدا ہرگز — رنگ ہوتا نہ اگر تیری خود آرائی کا
روئے دلدار کا نظارہ ہے اللہ اللہ — حوصلہ تو کوئی دیکھے مری بینائی کا
ہر جگہ نقشِ قدم یار کے ملتے ہیں ندیم — حوصلہ کیجئے پیدا تو جبیں سائی کا

تمنائے جنوں دیکر سرکارِ محبت نے ۔۔۔ کانٹے کو سراہا ہے ذرّہ کو نوازا ہے
مانعِ دید ہوا نور ہی خود بن کے حجاب ۔۔۔ جلوۂ یار عیاں تھا کوئی مستور نہ تھا
ہم مر کے جئے تو کیا اور جی کے مرے تو کیا ۔۔۔ ناممکن و ممکن کا ہر بات میں امکاں ہے
مہ و خورشید بھرتے ہیں نئے وحدت کا پیمانہ ۔۔۔ بنایا فیضِ ساقی نے یہ کسکے دِل کو میخانہ
دیکھنا شوقِ دید کا عالم ۔۔۔ جب وہ ہوتے ہیں میں نہیں ہوتا
کسی کے ہاتھ میں جامِ شراب ہوتا ہے ۔۔۔ کہ آفتاب سے آفتاب ہوتا ہے
چشمِ ساقی کا عجب فیض تھا میخانہ میں ۔۔۔ ایک دُنیا سمٹ آئی مرے پیمانہ میں
ہوش کہتے ہیں جسے اک بیخودی کا ہوش ہے ۔۔۔ اور بیہوشی جسے سمجھی ہے دنیا ہوش ہے
شاید یہ محبت کا حاصل نظر آتا ہے ۔۔۔ یا وہ نظر آتے ہیں یا دِل نظر آتا ہے
ہمہ تن گوش ہو رہا ہوں میں ۔۔۔ یعنی مدہوش ہو رہا ہوں میں
اپنے جذبوں سے بھی ندیم زار ۔۔۔ اب سبکدوش ہو رہا ہوں میں

کوثر برنی :-

مشہور علی خاں نام۔ کوثر تخلّص سنہ ۱۸۹۰ء میں بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کے شاگرد ہیں، غیور انسان ہیں تنگدستی میں توکّل کے ساتھ بسر کر رہے ہیں سکندر آباد تحصیل میں تحصیلات پر مامور ہیں۔ ان کا کلام درد کا مرقع ہے، پُرگو ہیں اور زود گو، کاش نظر ثانی بھی کیا کرتے۔

محفل میں محتسب نے جو ساغر اٹھا لیا ۔۔۔ رندوں نے آسمان کو سر پہ اُٹھا لیا
تعمیلِ حکمِ عشق سے موڑا نہ میں نے منھ ۔۔۔ جو غم عطا کیا اُسے ہنس کر اٹھا لیا
موسیٰ کو تابِ دید کہاں تھی جو دیکھتے ۔۔۔ جلوؤں کا لطف طور نے جل کر اٹھا لیا

ہیں دشمنوں کے لب پہ بھی اس کی شکایتیں
کمبخت کس کا دوست یہ چرخِ کہن بنا

نہ رکھ موقوف کل پر آج یہ قاتل سے کہنا ہے
وہ اب کہہ دے تجھے جو کچھ دلِ بسمل سے کہنا ہے

سنتے نہیں ہیں پھول جو فریادِ عندلیب
شاید بھرے ہیں کان نسیمِ بہار نے

یہ کس غضب کا اثر ہے جمالِ لیلیٰ میں
بلائیں لیتے ہیں پردے بھی اٹھ کے محمل کے

جو خارِ دشتِ محبت کا ذکر آتا ہے
تو پھوٹ پھوٹ کے روتے ہیں آبلے دل کے

ترے بیمارِ محبت سے تری فرقت میں
اٹھ کے بیٹھا نہ گیا بیٹھ کے اٹھا نہ گیا

آئے بھی ہیں تو الگ ہٹ کے کھنچے بیٹھے ہیں
اس سے ظاہر ہے کہ ملنا انھیں منظور نہیں

ہیں یہی ظلم تو ہم خاک میں مل جائیں گے
آسماں دور سہی ہم سے زمیں دور نہیں

ساتھ اشکوں کے جو رِس رِس کے لہو آتا ہے
دیکھنا کوئی کلیجے میں تو ناسور نہیں

میں اتنا بادہ خوار تھا ساقی کہ بعدِ مرگ
بنتا ہے میری خاک سے ساغر شراب کا

نظر بن کر کھٹکتے درد بن کر چٹکیاں لیتے
تمھیں آتا نہیں وقفِ غمِ آزار کر لینا

اے شوقِ دید ضبطِ تحمل سے کام لے
نازک مزاج ہیں انھیں تابِ نظر نہیں

تنکے تو چن رہا ہوں نشیمن کے واسطے
اللہ بجلیوں کا نہ بن جائے گھر کہیں

مٹا کر دلِ غمِ فرقت میں کچھ تسکینِ جاں کر لیں
اسی اک لفظ سے پوری ہم اپنی داستاں کر لیں

فقط پاسِ ادب صیاد کا ملحوظ ہے ورنہ
قفس میں ہم فغاں کرنے کو جب چاہیں فغاں کر لیں

زمیں بھی کچھ مکدر ہم سے کچھ گردوں بھی برگشتہ
زمانہ جنکا دشمن ہو ٹھکانا وہ کہاں کر لیں

گرے جو آسماں سے ٹوٹ کر شاخِ نشیمن پر
اسی بجلی سے روشن ہم چراغِ آشیاں کر لیں

وہ کیفی ہوں تمنا ہو اگر مے کی مجھے ساقی
اٹھا لائیں گھٹائیں دوش پر سامانِ میخانہ

حواس و ہوش کھو کر ہم نے سمجھا اس حقیقت کو
کہ پا لیتا ہے جو خود کو وہ ہو جاتا ہے دیوانہ

نئی دنیا بسانے کیلئے بزمِ محبت میں
چنے ہیں ہم نے پر کچھ جمع کی ہے خاکِ ویرانہ

بہار آتے ہی ہم ہوتے وہی کنجِ قفس ہوتا
چمن میں چار دن کو آشیاں آباد کیا کرتے

قفس اٹھتا ہے تو اٹھتے ہی بکھرے خاک کے
گویا دنیا سے جنوں آباد ویرانے میں ہے

کب جہاں میں یہ ہوا ہی جواب ایسا ہو جائے
آپ دنیا کے نہ ہوں آپ کی دنیا ہو جائے

کیا عجب مانعِ دیدار رہے رعبِ جمال
تیری بے پردگی میرے لئے پردا ہو جائے

عشق و الفت میں فقط میری ہی تخصیص نہیں
آپ اچھا جسے کہدیں وہی اچھا ہو جائے

جو کچھ شبِ فراق میں مجھ پر گزر گئی
ہنگامِ صبح ڈوبتے تاروں سے پوچھئے

ہے اُن کے منھ کو خون ابھی تک لگا ہوا
تلوؤں کا حال دشت کے خاروں سے پوچھئے

مرنے والے کا ذرا انجامِ الفت دیکھئے
کائناتِ عشق برہم ہے جہاں خاموش ہے

چھلکتی کیوں ہے ساقی جوئے گلنار رکھی ہے
یہ کیا شیشے میں تو نے حسرتِ مے خوار رکھی ہے

کسی دن رہن سے ہونا پڑیگا اہلِ تقویٰ کو
ابھی تو ایک ساغر کے عوض دستار رکھی ہے

کب مائلِ الطاف و عطا ہو نہیں سکتا
وہ چاہے تو ہو سکتا ہے کیا ہو نہیں سکتا

انسان نے سمجھا ہے فراست سے خدا کو
جو دور رگِ شہ سے ہو خدا ہو نہیں سکتا

ساقی تری جھڑکی سے خفا ہو نہیں سکتا
میخانہ سے مر کر بھی جدا ہو نہیں سکتا

وہ ابر اٹھا جھوم کے لا خم کو الٹ دے
اک جام میں کچھ میرا بھلا ہو نہیں سکتا

ساقی کی جو متوالی ادا کو نہیں سمجھا
وہ لطفِ مئے ہوش رُبا کو نہیں سمجھا

زاہد بھی بہک جائے جو دیکھے تجھکو
اے مستِ نظر اتنی شرابی ہو جا

تو باعثِ فخرِ نوجوانی ہو جا
پستی سے بلندی کی نشانی ہو جا

دل تری یاد میں سرشار رہے تو اچھا
تیرے ہی عشق کا آزار رہے تو اچھا

یاد بندے کو وہ اقرار رہے تو اچھا
حشر کے روز سے ہشیار رہے تو اچھا

بھر کے ساغر مجھے بیہوش ہی کر دے ساقی
پینے والا نہ گنہگار رہے تو اچھا

اپنے بیگانے سے خوش دل یہ رہے تو اچھا
ہر گھڑی داخل و شامل تیرے رہے تو اچھا

مشغلہ پینے کا ساقی کی ادا پر چھوڑا
لطف جینے کا مزا اور قضا پر چھوڑا

ساقی کو کبھی دل سے بھلا بھی نہیں سکتا
الفت سے لگا ہوں کو چھڑا بھی نہیں سکتا

توفیق اگر بادہ پرستی کی خدا دے
جو پی نہ سکے کیا وہ پلا بھی نہیں سکتا

آرام سے دنیا میں رہیں بھی تو رہیں کیا
آرام ہی آرام ہیں آرام نہیں کیا

ہم پر جو گزرتی ہے نہیں جان لیے ہیں
اللہ کے ہوتے ہوئے بندوں سے کہیں کیا

دنیا میں مسرت ہو مجھے اس کی بڑی کیا
مسرور رہے دل ٹل گئی آفت کی گھڑی کیا

ہیں عشق و وفا میں کبھی مشکل نہیں ہوتا
اس شکل میں یہ ذوق مکمل نہیں ہوتا

تنویر نگہ سے انوار نظر آتے ہیں تجھ کو
جلوہ نگہہ شوق سے اوجھل نہیں ہوتا

خالی ہے مے عشق سے مینا میرا
دیتا ہے خبر دیدہ بینا میرا

مدہوش کیا غمزہ ساقی نے مجھے
پینے کی برابر ہے نہ پینا میرا

دیوانہ ہو گیا کبھی دیوانہ بن گیا
مستی کا لطف دیکھ کے مستانہ بن گیا

ہر رگ جھوم جھوم کے مستانہ بن گیا
غنچے سے پھول پھول سے پیمانہ بن گیا

زاہد اگر ہے شوق جوانی شراب پی
کر ترک اپنی مرثیہ خوانی شراب پی

کیا فکر حیات و موت کے قصے فضول ہیں
کیا زندگی کی رام کہانی شراب پی

تلچھٹ عطا ہو محتسب روزگار کو
مجھ کو شراب معرفت کردگار دے

وہ کیف بھرا بادہ عطا کر ساقی
بڑھ جائے نظر جس کی شرابی ہو جائے

سہا

نام مولانا ممتاز احمد، تخلص سہا برنی، آپ ایک عرصہ سے ترک سکونت کر گئے ہیں، ہندوستان کے مشہور اساتذہ میں شمار ہے، صرف چند اشعار دستیاب ہو سکے ہیں:-

اٹھئے تو کہاں جائیے جو کچھ ہے یہیں ہے
گھر سے ترے باہر تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

جی بھر کے ذرا دیکھ تو لوں حسن کے جلوے
پھر کس کو تجھے چھوڑ کے جینے کا یقیں ہے

اب درد دروں جسم میں یوں پھیل گیا ہے
رکھتا ہوں جہاں ہاتھ سمجھتا ہوں یہیں ہے

خضر:-

محمد خضر برنی نام، خضر تخلص۔ مولانا فدا جانشین حضرت نواب مرزا داغ دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ بلند شہر کے نوجوان شعراء میں سر فہرست ہیں۔ ادبی خدمات کیلئے ہر وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔ اس تذکرہ کی تشکیل میں گلچیں کا نازک کام انھوں نے ہی انجام دیا۔ موصوف نے کچھ عرصہ دہلی رہ کر فانوس خیال ہفت روزہ، ماہنامہ نگارخانہ کی ادارت کی، اور اس کے بعد بلند شہر سے اپنا ذاتی اخبار "غریب" ہفتہ وار نکالا، موصوف "انجمن فروغ ادب" بلند شہر کے ناظم عمومی ہیں:-

شاید اسی کا نام محبت میں ہو سکوں
ہلکا سا اک درد بہانے سے جگر میں ہے

مشکل ہے فرق اتنا تو موت و حیات میں
جتنا تضاد ہجر کی شام و سحر میں ہے

کونین کا غم اپنا غم تھا دلِ قیس خدا مست آدم تنہا
افسوس ہجوم یاس میں ہم اب اپنا غم بھی سہہ نہ سکے

نیرنگیٔ عالم کے نقشے دیکھے ہیں بہت کچھ ہم نے خضر
وہ دور بھی گذرا ہے جسمیں اپنوں کو بھی اپنا کہہ نہ سکے

بڑھے جاتے ہیں حد سے حسن کامل دیکھنے والے
نہ کھو جائیں کہیں انوار منزل دیکھنے والے

سفینہ ہے یہاں تو کامیاب شورش طوفاں
ہمیں کیا کام دیکھیں سوئے ساحل دیکھنے والے

ذرا بسمل نگاہی کا تماشہ دیکھنے آکر
کہاں ہیں شوخیٔ انداز قاتل دیکھنے والے

سماتی ہیں مرے سینہ میں نظریں بجلیاں بنکر
ذرا آئینہ دیکھیں خضر کا دل دیکھنے والے

ممکن نہیں کہ جائیں ترے آستاں سے ہم
مجبور ہو کے آئے ہیں در دنہاں سے ہم

گمراہ اضطراب مسلسل نے کر دیا
منزل وہی تھی اپنی اُٹھے تھے جہاں سے ہم

تمہی مژگاں کے گر مہماں دِل میں نیشتر ہوں گے
ہماری آہ کے ہمراہ بھی لختِ جگر ہوں گے

دیوانگی میں خارِ مغیلاں کی شرط کیا
پھولوں سے بھی الجھتا ہے داماں کبھی کبھی

آرزوئے غم نہ چارہ ساز ہونا چاہیئے
دِل سکوں میں بھی خلش انداز ہونا چاہیئے

عکس انداز نہ گر کاکل پیچاں ہوتا
کیوں مری خاک کا ہر ذرہ پریشاں ہوتا

خضر ہوتی دلِ محزوں میں جو داغوں کی بہار
میرے ارمانوں کی دنیا میں چراغاں ہوتا

اب تو نے کام اے دلِ سوزاں بنادیا
داغِ اَلم کو شمع شبستاں بنادیا

اللہ رے احتجاج اُٹھا بعد میں نقاب
پہلے نگاہِ شوق کو حیراں بنادیا

کس کی ہوائے موجِ نفس گل کھلا گئی
کانٹوں کو کس نے چھو کے گلستاں بنادیا

آئے سرِ مژہ جو کبھی اشک اے خضر
آنکھوں کو خونِ دِل نے چراغاں بنادیا

جنوں والے بڑی مشکل سے یہ سرِ نہاں سمجھے
تجھی کو رازِ دِل جانا تجھی کو رازداں سمجھے

مسلسل آنسوؤں سے ہو رہی ہے شرحِ الفت کی
جو ہو دردآشنا کوئی تو میری داستاں سمجھے

وہ اُن کا تیر تھا دِل میں رہا یا لے گیا دِل کو
ہم اِن دونوں کے سودے کو حسابِ دوستاں سمجھے

انھیں کو کچھ ملا اپنا پتہ اے خضر الفت میں
جو تیری دُھن میں ہستی کو غبارِ کارواں سمجھے

اُٹھتی نہیں نگاہ فروغِ جمال سے
بے پردگی سے بھی تو حجاب آشکار ہے

کیفیتِ فراق کا عالم نہ پوچھیے
وہ سامنے ہیں پھر بھی وہی انتظار ہے

وہ بات کے دھنی ہیں نہ قولِ وفا درست
سب کچھ سمجھ رہا ہوں مگر اعتبار ہے

اے خضر اہلِ فتنۂ دوراں کو کیا کہوں — دیکھا ہے جب سے میری نظر بیقرار ہے

راحتِ جاں ہو گئیں تسکینِ ایماں ہو گئیں — آپ کی نظریں مری ہستی کا عنواں ہو گئیں
تیری آنکھوں تک تری نظریں تھیں ساماں سکوں — جب مرے دل میں اتر آئیں تو پیکاں ہو گئیں

محبت میں قرار آئے نہ آئے — تڑپ بر روئے کار آئے نہ آئے
تصوّر میں جو کچھ ہے نقش کر لے — پھر ایسا شاہکار آئے نہ آئے

جسقدر نظمِ جہاں کو دیکھتا جاتا ہوں میں — ذرّہ ذرّہ کو نشانِ بے نشاں پاتا ہوں میں
کارگاہِ جستجو میں اتنا کھو جاتا ہوں میں — زندگی کو ایک سعیِ رائیگاں پاتا ہوں میں
جب کبھی اُن کی حریمِ ناز سے آتا ہوں میں — ہر فضا میں نور برساتا چلا جاتا ہوں میں
حیرت [illegible] بتخانہ [illegible] — جس جگہ جلوے نظر آتے ہیں جھک جاتا ہوں میں
ابتدا وہ تھی کہ مرنا عاشقی میں کھیل تھا — انتہا یہ ہے کہ آپ جینے سے گھبراتا ہوں میں
اس طرح تکمیل کر دیوانگیِ عشق کی — حُسن چیخ اُٹھے کہ دیوانہ ہوا جاتا ہوں میں
کیا کوئی ہنگامہ تازہ ہے پھر بیتاب خضر — آج قلبِ مضطرب میں کیوں سکوں پاتا ہوں میں

کہتی ہے مجھے دنیا دیوانہ ہے دیوانہ — کس پردے میں سنتا ہوں کافر ترا افسانہ
قائم ہوئی اُلفت کی یوں سُرخیِ افسانہ — ہے شمع کے پہلو میں اک میّتِ پروانہ
مٹ کر ترے قدموں پہ حاصل شرف ہوگا — رہ جائیگا دنیا میں باقی میرا افسانہ

آپ کے در پہ اگر ایک بھی سجدہ ہو جائے — میری قسمت کا بلندی پہ ستارہ ہو جائے

جو تری راہِ محبت میں موت آئے مجھے — تو زندگی ہی مری لازوال ہو جائے

جب کبھی سامنے وہ آتے ہیں — بھول جاتا ہوں دل مصیبت کے

جسکو حاصل ہیں ترے دردِ محبت کے مزے — بھول کر بھی نہیں جاتا ہے وہ درماں کے قریب

تیری زلفوں کی بلاؤں نے سنوارا ہے اسے — کون اب آئے مرے حالِ پریشاں کے قریب

بندگی نے کچھ ہماری ہی جبیں رنگیں نہ کی — اُن کا سنگِ آستاں بھی تو حسیں ہوتا رہا

جذبِ اُلفت کی بہت کچھ سعی کی لیکن خضر — دل نشیں ہونا تھا جسکو دل نشیں ہوتا رہا

سحر

شیخ محمد اعتبار علی نام۔ سکندر آباد وطن۔ بہ حیثیت جیلر کے ریٹائرڈ ہوئے۔ کلام میں زنداں کا کہیں کم نہیں گنگنا چکے ہیں، شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری سے بھی شوق رہا ہے۔

الٰہی لطف جینے کے ملیں یوں خاک میں مل کے — خدایا تیرا آسرا چاہتا ہوں

مست آنکھوں نے کر دیا مدہوش — جام و مینا کا نام ہوتا ہے
میں پجاری ہوں اپنے در کا جہاں — آنسوؤں سے سلام ہوتا ہے
تابِ نظارہ کون لائے گا — جلوۂ حسن عام ہوتا ہے

کس طرح لائے نظر تابِ جمال اُٹھتے وقت — اللہ اللہ اب تو نظارہ بھی پردہ مجھے

تلاشِ یار کی منزل میں کھو گیا ہوں میں — وہ کارواں ہی گیا جسکا نقشِ پا ہوں میں

ذرا چھپ کے پیتا ہوں خلوت میں ساقی — کہ آج کل پارسا ہو رہا ہوں
ملی زندگی خاک میں مل کے مجھے — کسی شوخ کا نقشِ پا ہو رہا ہوں

زندگی اپنی سراپا جوش ہے — سازِ ہستی کس لئے خاموش ہے

تسلی دے کے بہلایا گیا ہوں — مگر ہر بار ٹھکرایا گیا ہوں
میری خلقت تھی ٹھنڈی آہ دل کی — تپِ غم دے کے گرمایا گیا ہوں
سحر خاموش الفت رنگ لائی — فسانہ بن کے دہرایا گیا ہوں

سحر کیوں کھول دیں آنکھیں دمِ نزع — کسے دیکھا نگاہِ واپسی سے

شمیم

سید قاسم حسین صاحب نام۔ شمیم تخلص۔ راجہ اکبر علی خاں صاحب رئیس پنڈراول کے خلف الرشید ہیں، توجہ تمام تر غزل پر ہے۔ چند قصائد بھی لکھے، غزلوں میں جذبات کی فراوانی ظاہر ہو کر تعلیم کی آبیاری ہوتی تو اور گل کھلاتے، خوش باش اور خوش فکر ہیں۔

جب کسی قول پہ ہوتا نہیں تجھ کو قرار — اس نہیں کو بھی لب یار ذرا ہاں کر دے

میں فنا ہو کے سما جاؤں ترے جلووں میں — تو مٹا کر مجھے عالم میں نمایاں کر دے

ساز نفس بگڑ چلا آنکھیں بھی بند ہو گئیں — لٹ گئی کائنات دل بالیں سے کیا گیا کوئی

سن کے کیا کیجئے گا آپ کو زحمت ہو گی — ایک بھولا ہوا بے ربط سا افسانہ ہے

فرقت میں حد نہیں ہے مرے انتشار کی — صورت نکالئے کوئی صبر و قرار کی

تکلف کیا ہے چھیڑو خوب دل کو تیر مژگاں سے — عزیز اپنا نہیں کرتا کوئی سامان مہماں سے

چلتی نہیں کسی کی مقدر کے سامنے — موجود چارہ ساز تھے مگر دیکھتے رہے

بربادیاں تھیں پیش نظر دل کی ہجر میں — دیکھا نہ جا رہا تھا مگر دیکھتے رہے

یوں اشک ٹپکتے ہیں مری دیدۂ تر سے — ساون میں کبھی جیسے گھٹا جھوم کے برسے

پھر روح لرز جاتی ہے ارباب وفا کی — بھولے سے جو لیتا ہے کوئی نام تمنا

مجھ کو ہنسی ہنسی میں رلا کر چلے گئے — تصویر اضطراب بنا کر چلے گئے

حال دل آپ کو بتائیں کیا — آپ تو کیا کا کیا سمجھتے ہیں

موت کو ہم حیات جانتے ہیں — زندگی کو قضا سمجھتے ہیں

خود ہی ہوں گے وہ بے وفا قاسم — جو تجھے بے وفا سمجھتے ہیں

میری تقدیر کی رسائی ہے — موت پیغام دوست لائی ہے

وہ کہاں، ہم کہاں، وہ بات کہاں
اب تو عرصہ ہوا جدائی ہے

منزل کے اشتیاق میں یہ بھی نہیں خیال
جاتے ہیں کس طرف کو چلے تھے کہاں سے ہم

بجلی گرے کہ آندھیاں آئیں جو ہو سو ہو
مدت ہوئی کہ چھوٹ گئے آشیاں سے ہم

بیخودی میں جو لب پہ نام آیا
میں یہ سمجھا کوئی پیام آیا

نظر ان سے جب بھی ملائی گئی ہے
کھٹک دل میں ہر بار پائی گئی ہے

گرے نہ جانے اب کدھر برقِ جلوہ
نقاب آج رُخ سے ہٹائی گئی ہے

کون کہتا ہے کہ ہوتا نہیں اُلفت میں اثر
دیر میں ہوتی ہے تاثیر مگر ہوتی ہے

کھو سا جاتا ہوں اُسے دیکھ کے اس طرح ہم
دل کو میری نہ مجھے دل کی خبر ہوتی ہے

کھیل سمجھے تھے دِل لگی دِل کی
خون رُلائے گی بیکلی دِل کی

دِل کسی کام میں نہیں لگتا
ہائے کیا چیز ہے لگی دِل کی

پھر آئیں گذری ہوئی ساری عیش کی راتیں
گر آپ چاہیں تو ماضی بھی حال ہو جائے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا عزیز کیوں ہی ہیں
وہ زندگی کہ جو خواب و خیال ہو جائے

دیکھ کر بے بسی کو بِسمل کی
کانپ اٹھیں انگلیاں بھی قاتل کی

بیٹھا ہوں اِک ہلاکِ ستم دِل لئے ہوئے
اپنے تمام عشق کا حاصل لئے ہوئے

تیرِ نگاہِ یار اِدھر پھر ہے ملتفت
عرصہ ہوا اٹھا جائزہ دِل لئے ہوئے

بعد میں تم کو بتاؤں گا کہ کیا کھویا ہے
دِل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھا لوں تو کہوں

دفعتاً حسن کے بگڑ جائیں گے افسانۂ غم
پہلے اے دِل انھیں باتوں میں لگا لوں تو کہوں

شاید دلِ بیتاب پہ یہ سخت گھڑی ہے
آتی ہیں بڑی دیر سے آہوں کی صدائیں

یاد آئے گا جنت میں بھی برسات کا موسم
قاسم یہ ہوا، اور یہ ساون کی گھٹائیں

آؤ اب تو گلے سے مل جاؤ / دور کر دو حجاب کی باتیں
تصدّق زلفِ یار چھوڑ بھی دے / دل نہ کر پیچ و تاب کی باتیں
ادنیٰ سا یہ بھی میرے تصوّر کا تھا کمال / بیٹھے رہے وہ میرے مقابل تمام رات

کلیم :-

نام ڈاکٹر محمد صدیق دندان ساز، تخلص کلیم برنی، خلف منشی محمد شیر خان، تاریخ پیدائش سنہ ۱۹۰۲ء آپکی اردو، فارسی کی تعلیم مدرسہ انجمن حمایت الاسلام باڑہ بلیماران دہلی میں ہوئی۔ آپکے کلام میں پختگی و برجستگی اور ندرت پائی جاتی ہے، آپ ذی علم اور ذہین ہونیکے باوجود بھی اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے ہیں۔

رباعی

انسان کا جوہر ہے مروّت کرنا / دشمن کی بھی مشکل میں اعانت کرنا
یہ عین عبادت ہے زمانے میں کلیم / انسان کا انساں سے محبت کرنا

چشمِ ساقی آشنائے دل نظر آنے لگی / زندگی میخانہ کا دل نظر آنے لگی
دل کی آنکھیں کھل گئیں تو اٹھ گئے سارے حجاب / اپنی منزل یار کی محفل نظر آنے لگی
کشتیِ دل جب تمہارے آسرے پہ چھوڑ دی / موجِ طوفاں بھی مجھے ساحل نظر آنے لگی
پھر گئی آنکھوں میں تصویرِ جہانِ بے ثبات / کائناتِ زندگی باطل نظر آنے لگی

اک نظر دل کی طرف ہے اک نظر جاں کی طرف / آرزو لے جا رہی ہے کوئے جاناں کی طرف
کھل گئیں غنچوں کی آنکھیں کھل گئے پھولوں کے دل / آ رہے ہیں آج شاید وہ گلستاں کی طرف
کیا قیامت تھی کہ اٹھتے ہی نگاہِ عرضِ پاک / خاک ہو کر رہ گئی دربارِ جاناں کی طرف
رقص کرتی کائناتِ عشق میں ہر لحظہ / تم نے دیکھا ہی نہیں قلبِ پریشاں کی طرف
جانے کس عالم میں ذوقِ دید لایا ہے کلیم / ہیں یہاں جلوے ہی جلوے چشمِ حیراں کی طرف

محبت ہے تو غم کے تذکرے بیتابی کے افسانے / نہ تم سے مختصر ہونگے نہ ہم سے مختصر ہونگے

اللہ رے تاثیر تری مست نگہ کی — قابو میں نہ دل ہے نہ نظر ہے نہ زباں ہے

جب اپنی فکر ہوتی ہے جہاں کی فکر ہوتی ہے — جب اپنا غم نہیں ہوتا کسی کا غم نہیں ہوتا

رازداریٔ الم تسلیم ضبطِ غم بجا — خود بخود آنسو نکل آئیں تو پھر کیا کیجئے

نہ فکرِ غم نہ احساسِ تمنا ہے جہاں ہیں ہم — محبت ہی محبت کارفرما ہے جہاں ہیں ہم

شمع کی فطرت میں جلنا ہے جلے اور پھر جلے — دیکھنا یہ ہے کہ پروانے میں کتنا جوش ہے

جہانِ عشق سے ہٹ کر مقامِ عشق پر پہنچو — کبھی آیا نہیں جاتا کہیں جایا نہیں جاتا

دل کو قرار ہے نہ نظر کو قرار آج — شاید وہ کر رہے ہیں مرا انتظار آج

کسے معلوم اس جانِ چمن کی شانِ رعنائی — لٹا دی جس کے عارض پر بہارِ زندگی ہم نے

وہ بدنصیب دین کا رہا نہ دنیا کا — جسے کہ در سے اپنے اٹھا دیا تو نے

میں اگر چاہوں تو اپنے کو مٹا بھی نہ سکوں — تو اگر چاہے تو کونین کو ویراں کر دے

بے نیازِ عشق ہے راز و نیازِ عشق ہے — کعبہ ہو یا بتکدہ سجدے کئے جاتا ہوں میں

نظر سے ہے پنہاں دیار تو کیا — ہماری نظر تو دیارِ یار پہ ہے

کیا سنائیں انقلابِ عشق کا افسانہ ہم — وہ ہوئے اپنے تو خود سے ہو گئے بیگانہ ہم

ہے ذوق میسر میخانہ تو یہ اعجاز پیدا کر — درِ میخانہ خود لبیک کہہ کر باز ہو جائے

بارِ خاطر گر نہ ہو تو اس طرف بھی اک نظر — اب مرے دردِ محبت میں کمی ہونے لگی

بیقراری آہ و زاری یاس حرماں درد و غم — عشق میں جو کچھ بھی مل جائے وہی انعام ہے

برنگِ شمس و قمر چمک کر برنگِ گل کھل کے تو مہک کے — عیاں ہوا لو ہر اک نظر پہ گرنہ اٹھا نقاب تیرا

اے برق پھونک لیکن اتنا خیال کر لے — صیاد کی امیدیں قائم ہیں آشیاں سے

مجھی پر انکشافِ رازِ الفت ہوتا جاتا ہے — مجھی سے احتیاطِ پردہ داری ہوتی جاتی ہے

ہر چند التفات کیا چشمِ یار نے — پایا نہ پھر بھی چین دلِ بیقرار نے
خبر نہیں حرم و دیر ہیں کہاں ہم تو — تمام عمر محبت کی رہگذر میں رہے
ترے حجاب کی خاطر جو بے حجابیوں میں — ہلال ہوں مہ و انجم ہو آفتابیوں میں
شبنم نے کہا یہ پھولوں سے تم رازِ محبت کیا جانو — ہنسنے میں کہاں وہ لطف ملا رونے میں جو اکثر پایا ہے
اُسی سے لذتِ کیفِ بہارِ گلستاں پوچھو — میسر جس کو ان رنگیں لبوں کا جام آجائے

شوقی :-

حکیم محمد صدیق نام۔ شوقی تخلص۔ سکندرآباد وطن۔ ایک عرصہ دراز سے اجمیر شریف میں مطب کرتے ہیں۔ کوئی دیوان یا مجموعہ کلام دیکھنے کو نہ مل سکا۔ اور معلوم ہوا کہ اُن کے پاس بھی نہیں، پختہ گو ہیں فکر سے کہتے ہیں۔

رخِ روشن کا تصوّر ہے کہ ہے جلوۂ طور — مہِ کامل اُتر آیا ہے کہ ہے تو دل میں
صبر اے ضبط کہ ارمان بہے جاتے ہیں — بن گئے صورتِ ملزم مرے آنسو دل میں
چشمکِ برق ہے یا لمعۂ تیغ و خنجر — مہِ نو ہے کہ خیالِ خمِ ابرو دل میں
ضبطِ گریہ نے بچایا مجھے جلنے نہ دیا — آتشِ غم کو بجھاتے رہے آنسو دل میں
شکر ہے شکلِ رہائی نظر آئی شوقی — آج بدلا ہے مرے درد نے پہلو دل میں

اگر مان لے وہ وفائیں ہماری تو سہنا جفاؤں کا مشکل نہیں ہے
ستم تو یہ ہے وہ جفا جو ستمگر ہماری وفاؤں کا قائل نہیں ہے
مری بات مانو نہ مانو خوشی ہے تمھاری خوشی ہے جو چاہو کرو تم
مگر پوچھتے ہو تو کہتا ہوں سچ سچ، عدو منھ لگانے کے قابل نہیں ہے

بجا ہے تمھارا یہ دِل لیکے کہنا کہ مشکل ہے آپ دیکے دِل ہمکو لینا
یہ مانا کہ آساں نہیں دِل کا لینا ، مگر جان دینا تو مشکل نہیں ہے

بلا کی تھی جادو اثر وہ نظر جس نے اُٹھتے ہی ایک پل میں کایا پلٹ دی
جُھکا کر ذرا میں نے گردن جو دیکھا تو دیکھا کہ پہلو میں وہ دِل نہیں ہے

خُدا کے بھروسہ پہ چھوٹی ہوئی ہے نہیں ہے اسے ناخدا کی ضرورت
یہ ہے ایک غریقِ محبّت کی کشتی وہ کشتی جو محتاجِ ساحل نہیں ہے

انھیں دیکھیے ہیں سرِ راہ پھرتے صریحاً مرے خوں سے آلودہ دامن
مگر کیا کہوں کہنے والوں کو یارب جو پھر کہہ رہے ہیں یہ قاتل نہیں ہے

نہ دیکھا اثر تیری آہوں میں ہم نے نہ تاثیر کچھ تیرے نالوں میں دیکھی
یہ ثابت ہوا عشق سے تیرے شوقی کہ فن میں ابھی اپنے کامل نہیں ہے

حبیب :-

حبیب اللہ نام۔ حبیب تخلص ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے، بلند شہر کے ایک پُرانے اور شریف خاندان کے فرد ہیں محمد یٰسین صاحب تسکین سورولوی کے شاگرد ہیں۔ اکابر شعرائے بلند شہر میں گنے جاتے ہیں۔ کاروبار اور شوقِ موسیقی سے دوگونہ رابطہ ہے۔ اس کی جھلک ان کی مترنّم غزلوں میں ملتی ہے، صاحبِ دیوان ہیں۔ ترنّم کے ساتھ غزل میں ڈوب کر پڑھتے ہیں اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔

میکدہ بردوش وہ مستِ خرام آ ہی گیا
مژدہ اے تشنہ لبی گردش میں جام آ ہی گیا
جذبۂ ناکام آخر کچھ تو کام آ ہی گیا
وہ نہ آئے خود تو کیا اُن کا پیام آ ہی گیا

جب کبھی پیدا ہوا دل میں خیال ترکِ مے
دفعتاً وہ سامنے بادہ بجام آہی گیا

رفتہ رفتہ ہو گیا رازِ محبت آشکار
آتے آتے اُن کے لب پر میرا نام آہی گیا

تقسیم مسرّت میں ہم نے دل غم کا خوگر پایا ہے
کچھ اُنکی طبیعت پائی ہے کچھ اپنا مقدر پایا ہے

عرفانِ حقیقت مشکل ہے یہ شیخ و برہمن کیا جانیں
[illegible] دیر و حرم [illegible] دل میں اکثر پایا ہے

لے دے کے ہیں تنہائی اک درد ہی میرا باقی ہے
[illegible] اب دل میں [illegible] پایا ہے

اللہ نے صنعت یکتائی [illegible]
[illegible] کبھی [illegible] وہ کعبے نے پتھر پایا ہے

ترا ساتھ دے سکوں گا نہیں عمر بھر کبھی واعظ
تجھے ناز ہر قدم پہ مجھے ہر قدم پہ ڈرنا

وہ حسین شب کا منظر یہ طلوعِ صبحِ محشر
ترے بے نقاب رخ پر تری زلف کا بکھرنا

مرے ساتھ [illegible] لگ میں یہ ستم ظریفیاں ہیں
مجھے آشیاں دکھا کر مرے بال و پر کترنا

یہی جیب شاید تری جستجو کا حاصل
کبھی تھک کے بیٹھ جانا کبھی [illegible]

جب آنکھ سے آنسو بہتے ہیں دل [illegible]
[illegible] تجھے [illegible]

ہم سامنے آئے جب تیرے باقی نہ رہا احساسِ نظر
[illegible] کی دنیا ختم ہوئی دیدار [illegible]

مسلکِ دیر و حرم سے بھی کنارا کیجئے
اب تو یہی چاہتا ہے خود کو [illegible] کیجئے

ذرہ ذرہ بن گیا ہے حسن کا [illegible] عشق
[illegible] یہاں کس کو سجدا کیجئے

آپ فرماتے تو ہیں تلقین ضبطِ عشق کی
دل میں [illegible] تو پھر کیا کیجئے

آپ اپنے دل سے پوچھیں دل کی [illegible]
مجھ کو [illegible] ذرا [illegible] تو تڑپا کیجئے

روح میں ہوتا نہیں ہیں [illegible] سے [illegible]
شادمانی کے لئے کچھ غم بھی پیدا کیجئے

یہ بیکدہ نہیں کو [illegible] زاہد نادان
یہاں تو زہر بھی ہوتا ہے انگبیں معلوم

خیالِ یار ترے آسرے پہ جیتا ہوں
وگرنہ میری حقیقت کیے نہیں معلوم

قدم قدم پہ قدم ڈگمگا رہے ہیں حبیب
تلاش اس کی ہے جس کا پتہ نہیں معلوم

دل سے نکلی ہے ترا آسرا لیکر فریاد
سن لے سن لے مری اے خالق اکبر فریاد

اللہ اللہ یہ اثر گریۂ الفت کا حبیب
بن کے نکلی ہے مری آنکھ سے گوہر فریاد

بشیرؔ

نام بشیر احمد۔ بشیرؔ تخلص۔ قصبہ جہانگیر آباد کے باشندہ ہیں۔ اور آج کل حسن پور ضلع مرادآباد میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کے کلام میں سوز و گداز اور پڑھنے میں والہانہ انداز پایا جاتا ہے۔

پلائے ساقیا نے اٹھوں گا کے وہ مدہوش نہیں
خود فراموش ہوں احسان فراموش نہیں

نہ پوچھ لذت غرقابی محبت کو
قریب آیا تو ساحل سے کنارہ کر لیا میں نے

یاد خود تیری تصور ساز ہے
میں جہاں ہوں جلوہ گاہ ناز ہے

کشتۂ انجام الفت مژدہ باد
اب یہاں آغاز ہی آغاز ہے

جھجک کے اٹھا دیا نہ رخ عشق سے نقاب
تنظیم کائنات پریشاں نہ کر سکے

ان کو ہے اختیار حسن دکھا دیں رنگ و گل
جو خود کو راز دار گلستاں نہ کر سکے

ترے سودائی کو پابندی آداب الفت کیا
بہت مصروف کار عشق اور فرصت ہی فرصت ہے

ایک دل ہے اسے کس کس سے جدا کر دوں
کوئی ذرہ بھی نہ چھوڑا تری رعنائی نے

شگفتگی دل داغدار کیا کہنا
بہار اور خزاں کی بہار کیا کہنا

میری نظر نہ اٹھی شکوۂ جفا کر کے
تاثر نگہ شرمسار کیا کہنا

شکست ہے کہ عصیاں کا حوصلہ نہ رہا
وفور رحمت پروردگار کیا کہنا

بدل دی فطرت سائل ترے در کی گدائی نے
طلب کرتا ہوں لیکن ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

اسے مرنے جینے کی فکر کیا جسے کام ہو اسی کام سے
کبھی مر گیا ترے نام پہ کبھی جی اٹھا ترے نام سے

زحمتِ ترکِ تمنّا جو گوارا ہو جائے — میں سمجھتا ہوں کسے میری تمنّا ہو جائے
ہیں قیدِ تعیّن میں بھی آزاد دو عالم — تو اپنی ادا دیکھنے والوں کی ادا دیکھ

کسی کی کم سنی میں شانِ محشر ڈھونڈھنے والے — مبارک ہو قیامت قدِ آدم ہوتی جاتی ہے
وہ میری جس قدر تسکینِ خاطر کرتے جاتے ہیں — طبیعت اور پُر غم اور پُر غم ہوتی جاتی ہے
بشیرؔ اب تو حجابِ حسن جتنے بڑھتے جاتے ہیں — نگاہِ شوق رشکِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

قدم اس حوصلے سے جادۂ منزل میں رکھا ہے — اگر چاہوں تو منزل بھی شریکِ کار ہو جائے
مسلسل التفاتِ خاص و پیہم پرسشِ پنہاں — اب اس کے بعد دیوانہ ہی جو ہشیار ہو جائے
بشیرؔ اس نامرادِ دید کی حسرت کو کیا کہیے — وفورِ شوق جس کو مانعِ دیدار ہو جائے

لگی ہے لو مکینِ لامکاں سے — غرض ہے سر سے نہ سنگِ آستاں سے
مرا افسانہ اور اُن کی زباں سے — زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے
بگڑ کر قسمتِ نامہرباں سے — اُلجھ بیٹھا ہوں سعیِ رائیگاں سے
جز اک اللہ مآلِ سعیِ منزل — نہیں بیٹھا ہوں اُٹھا تھا جہاں سے
مری قسمت میں تھی قیدِ عناصر — قفس لے کر چلا ہوں آشیاں سے

اک بار اک تبسّم سا جو فرما کے رہ گئے — ارماں بہت سے دل میں جگہ پا کے رہ گئے
اُف اُف طلسمِ شوق کہ منزل سے منزلوں — ہم بارہا فریبِ نظر کھا کے رہ گئے

مرا لٹنا سراپا عشق ہو کر عشق کے ہاتھوں — تماشا ہے کہ خود رہزن ہوں خود ہی اہلِ دولت ہوں

مرا سینہ حقیقت میں ہے رنگِ سینۂ نے ہے — کسی کی سانس ہو میری فغاں معلوم ہوتی ہے
ہر اک حالت سے غنی ہیں جیسے گدا لیکن — کسی کو یہ بھی خبر ہے کہ کیا [illegible]

سجے ہیں میکدے تقریب ہی تجدید ایماں کی —— کہ ہر قالب نے تو یہ آج زیبِ طاقِ نسیاں کی
اُسے تیرے کرم کی کیا خبر ہے —— کہ جس کی تیرے دامن پر نظر ہے
ثنا پہ اپنی مسرت سے جھومنے والے —— جو تجھ کو تابِ ملامت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ضیاؔ:

عبدالرحیم خان نام، ضیاؔ تخلص۔ عمر ۴۹ سال قصبہ بگراسی ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں پولیس میں ملازم رہے، اب دولت پور میں مقیم ہیں۔ کلام پُرگوئی کا غماز ہے۔ مطالعہ کوئی ایسا وسیع نہیں۔ رسمی اشعار کی کثرت ہے۔

ستم تو یہ ہے وہ بچ بچ کے مجھ سے چلتے ہیں —— غضب یہ ہے کہ انھیں مجھ سے اجتناب نہیں
بتا دے مجھ کو یہ نیرنگِ عشرتِ دُنیا —— فنا کے ہاتھ میں کیا ساغرِ شراب نہیں
دل میں اٹھنے نہ لگیں سوزِ دروں کے شعلے —— خونِ دل جل کے نہ رُک اور سویدا ہو جائے
تصور سے غفلت میں جان آگئی ہے —— خموشی سے محشر بپا ہو رہا ہے
وجودِ عدم میں گرہ جو لگی تھی —— وہ عقدہ سرِ حشر وا ہو رہا ہے
ہمارا خرمنِ ہستی سراپا دل نہ بن جائے —— نفس کی آمد و شد جذبہ کامل نہ بن جائے
کیوں خیالِ ناوکِ مژگاں دلِ مضطر میں ہے —— دیکھتا اک روز روزن سینۂ گوہر میں ہے
پیری میں جوانی مرا دل توڑ گئی —— طاقت مرے ہر عضو سے منہ موڑ گئی
یہ جل کے کہتا ہے محفل میں اس سے پروانہ —— دیا جو تو نے دیا وہ دیا جلا کے مجھے
عاشقِ خستہ حال کا حال خراب دیکھ کر —— حُسن سے معترض نہ ہو عشق کا اعتبار کر
جرم سیاہ سب مرے تیری عطا کے منتظر —— میری خطائیں برطرف اپنی عطا شمار کر
طواف کرتا ہے پروانہ بزمِ عشرت میں —— مزہ تو جب ہے وہ جل جائے اور جلائے چراغ

سجدے کہتے ہیں تڑپ کر مری پیشانی میں — کہ درِ یار پہ تو چل کے جبیں سائی کر

صابر :-

نام منشی محمد اسحاق۔ صابر تخلص۔ آپ جمرپور ضلع بلند شہر کے باشندہ ہیں، اور دہلی میں رہتے ہیں آل انڈیا مشاعروں۔ ریڈیو پروگرام وغیرہ میں عام طور پر حصہ لیتے ہیں۔ نمونۂ کلام درج ہے۔

اگر وہ مسکرا کر رہ گئے ہیں — دو عالم جگمگا کر رہ گئے ہیں
ہزاروں بار شہرِ راہِ الفت — حقیقت کو چھپا کر رہ گئے ہیں
ہماری گفتگو کیا آرزو کیا — حدیثِ دل سنا کر رہ گئے ہیں
تصور بھی کیا جب عرضِ غم کا — مرے لب تھرتھرا کر رہ گئے ہیں
اگر وہ چل دیئے ہیں مسکرا کر — تو ہم آنسو بہا کر رہ گئے ہیں
کسی کے در پہ آپ کیوں جائیں صابر — وہ میرے دل میں آ کر رہ گئے ہیں
ان کے اندازِ تغافل میں کمی ہونے لگی — یعنی توہینِ مزاجِ عاشقی ہونے لگی

پیامی :-

نام فصیح حیدر۔ پیامی تخلص۔ ہونہار شاعر ہیں۔ ان کا نام فصیح اور کلام بلیغ۔ عمر ۲۲ سال حضرت کیف مرادآبادی کے شاگرد ہیں۔

کبھی اس طرف اشارا کبھی اس طرف اشارا — یہ کدھر بتا رہا ہے ترا حسنِ عالم آرا
مری بیکسی ہے گویا مرا رازِ کامیابی — دلِ خستہ ہے طلب بھی جہاں مل گیا سہارا
غم مری تاریک دنیا کو منور کر گیا — برق چمکی آشیاں میں روشنی ہونے لگی
عشق نے نظریں اٹھائیں میکدہ سا بن گیا — حسن نے نظریں ملائیں میکشی ہونے لگی

ہو جو ممکن تو بخش دے اے دوست
وہ غمِ عشق جو عذاب نہ ہو

اے خوف کھانیوالے ہر برقِ بے اماں سے
تعمیرِ آشیاں ہے تخریبِ آشیاں سے

اظہارِ آرزو ہو اور حسن کی زباں سے
کس درجہ منفعل ہوں جذبِ غمِ نہاں سے

زندگی کو ثبات کچھ بھی نہیں
حاصلِ کائنات کچھ بھی نہیں

دائمی ہجر بھی ہے وجہِ سکوں
عارضی التفات کچھ بھی نہیں

ان کے جلوے ہیں دائمی لیکن
میرا نقشِ حیات کچھ بھی نہیں

ایک تصویر کے ہیں دو رُخ ہیں
فرقِ موت و حیات کچھ بھی نہیں

جمالِ دوست نے وہ حیرتِ نظارہ بخشی ہے
جہاں چاہوں وہیں تشکیلِ بزمِ ناز ہو جائے

گرفتارِ قفس وہ حسرتِ پرواز پیدا کر
کہ بے بال و پری خود قوتِ پرواز ہو جائے

یہی امید احساسِ الم ہونے نہیں دیتی
کہ شاید اب بھی مجھ پر التفاتِ ناز ہو جائے

حیاتِ بے کیف کی خوشی کیا اگر غمِ عاشقی نہیں ہے
جو ان سے بیگانہ ہو کے گذرے وہ زندگی زندگی نہیں ہے

الم سمجھ کر گذارنے والے، فراق کے غم سے ڈرنے والے
وصال کی فکر کرنے والے، ہوس ہے یہ عاشقی نہیں ہے

بدل گئیں زندگی کی راہیں قدم میں لرزتی نگاہیں
تری محبت میں لیکن اے دوست اب بھی کوئی کمی نہیں ہے

رہِ عدم میں فریبِ جستجو کا حال کیا کہیے
وہیں منزل نہیں ہوتی جہاں معلوم ہوتی ہے

زمانہ گذرا کسی کو دیکھے مگر ابھی تک سرور سا ہے
نظر نظر برقِ طور سی ہے نفس نفس میں جو نور سا ہے

ہے زینتِ تصور وہ مہ جبیں ابھی تک
میری نگاہ میں ہے دنیا حسیں ابھی تک

لاکھ انقلاب آئے دنیائے عاشقی میں
جس در پہ جھکی تھی وہیں ہے میری جبیں ابھی تک

وہ اک جھلک دکھا کر روپوش ہو گئے ہیں
لیکن دھڑک رہا ہے قلبِ حزیں ابھی تک

ہائے وہ حالت کہ جب ہو عشقِ مجبورِ نیاز — اُف وہ عالمِ حُسن جب بر ہم نظر آنے لگے
عشق کی اس میں خطا ہے اور نہ کچھ دل کا قصور — تم نے جس صورت میں چاہا ہم نظر آنے لگے

تاؤں ہیں مہر و ماہ میں، شام و سحر میں ہے — سوز و رنگ سے وہ جانِ تمنا نظر میں ہے
رہبر ہو، راہزن ہو، خضر ہو کہ ہم سفر — جو بھی یہاں ہے دوست! تیری رہگذر میں ہے
راہیں جدا جدا ہیں، طریقے جدا جدا — یعنی بقیدِ فکر زمانہ سفر میں ہے

بخیبر:

نام شیخ عبدالمجید بقول جگر "آپ صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن" یعنی کہ بایں ہمہ اُمی محض شاعر بھی موصوف سکندر آباد میں ۱۹۴۸ء میں ہیلا اُٹھے انکی شاعری اس امر کا ثبوت ہے کہ سکندر آباد کی طبیعتوں میں مزاجِ شعر و سخن کس حد تک رچا ہوا تھا۔

آرہے ہیں آنکھ سے اشکِ روانِ التجا — اب محبت بن گئی ہے کاروانِ التجا
میرے دل کو دیکھ کر مضطر ہے ساری کائنات — بن گیا ہر ذرہ اک شرحِ نہانِ التجا
تیری کل ہستی سراسر سجدہ ریزِ آرزو — آپ کا نقشِ کفِ پا آسمانِ التجا
دل کے ہر ذرہ کو رسمِ کافری بخشی گئی — ہو رہا ہے از سرِ نو امتحانِ التجا
پیش کرتی ہے نظر اس نو بہارِ ناز کو — بخیبر کی آنکھ ہے اب گلستانِ التجا

دیکھنا ہے اب تو یہ نکہتِ گلزارِ وفا — آپ جانِ آرزو اور ہیں پرستارِ وفا
اک ستم پیشہ پہ ساری زندگی کردی نثار — جان دیکر ہی رہا آخر کو بیمارِ وفا

تیری نظروں نے دل میں چھوڑا کیا — اب محبت کا آزمانا کیا
میں تمھیں پہ نثار ہوتا ہوں — جو تمھارا ہو اس کا مرنا کیا
اک عمر جس نے مستیٔ غم میں گزار دی — وہ بخیبر نہیں تھا کوئی ہوشیار تھا

ذرّہ ذرّہ کو ترا عرفان جلوا ہو گیا
اے نگاہِ ناز اب عالم تماشا ہو گیا

آنکھ کے پردوں میں عریاں ہے محبّت کی نظر
سامنے آ۔ اے بتِ طنّاز پیدا ہو گیا

یوں تو سینہ سے تری آواز آتی ہی رہی
میں نے جب دل پر نظر ڈالی تو پیدا ہو گیا

ہٹا کے دونوں جہاں سے مری نگاہوں کو
مری نگاہ کے پردوں میں آکے لوٹ لیا

نقاب ڈال کے بکھرا کے دوش پر گیسو
مجھے سحر کی محفل میں لا کے لوٹ لیا

نگاہِ دل کو بھی حاصل بنا کے دیکھ لیا
ترے خیال کو محفل بنا کے دیکھ لیا

کہیں ملے نہ ہمیں پائے نازنیں کے نقوش
ہر ایک ذرّہ کو منزل بنا کے دیکھ لیا

سکونِ دل نہ ملا بزمِ محبّت میں
انھیں بھی رونقِ محفل بنا کے دیکھ لیا

دل پہ اک نادیدہ صورت چھا گئی
خود بخود ہی درد کا ساماں ہوا

کس حال میں نہ جانے دلِ بے قرار تھا
جب وہ مرے قریب تھے میں اشکبار تھا

مضطر:

پنڈت رام کشن مضطر ککوڑوی۔ قصبہ ککوڑہ ان کا وطن ہے۔ عمر کوئی بیس ۲۰ سال ہوگی غزل خوب پڑھتے ہیں، اور نظم خوب لکھتے ہیں۔ ترقی کرینگے، مگر محنت اور مطالعہ شرط ہے۔ آداب میں بہت نستعلیق، راشننگ کے محکمہ میں ملازم ہیں۔ فراق گورکھپوری کے شاگرد ہیں۔

یہ سحر ہم تم یہ میری بیکسی شامِ فراق
زندگی کو رو رہی ہے زندگی شامِ فراق

دور تک غم کی فضائیں جیسے گھٹتا ہو دھواں
ہر طرف ہے بیکسی چھائی ہوئی شامِ فراق

لالہ زارِ زندگی ہے ایک دھندلا سا غبار
بزمِ رنگ و بو ہے کچھ بے کیف سی شامِ فراق

آہ مضطر اس طرح آنکھیں مری ویران ہیں
جیسے غم نے چھین لی ہے زندگی شامِ فراق

اللہ رے یہ تیرگیٔ غمِ شبِ فراق
وحشت طرازِ یاس کا عالم شبِ فراق

آنسو ہیں گرم گرم رواں تر ہے آستیں
غرقِ الم ہے دیدۂ پُرنم شبِ فراق

بستی یہاں سکوں کی نہیں دور دور تک
ہر سو ہے اضطراب کا عالم شبِ فراق

جیسے اسے خوشی سے کوئی واسطہ نہیں
کچھ اس طرح نشاط سے برہم ہے زندگی

اے حسنِ دوست دیدۂ بیخواب کی قسم
اب ایک انتظارِ مجسم ہے زندگی

دھندلا سا نقش ہوں نگہِ التفات کا
بھولی ہوئی سی یاد کا عالم ہے زندگی

مضطر میں آشنائے غمِ کائنات ہوں
ہر انقلابِ درد سے محرم ہے زندگی

سنا رہا ہوں ہر اک دل کی بات سن اے دوست
صدائے نغمۂ سازِ حیات سن اے دوست

ابھی نہ سو کہ ہے آغازِ داستانِ الم
تمام قصۂ دردِ حیات سن اے دوست

مری حیات ہے تصویرِ انقلابِ جہاں
مری نظر سے غمِ کائنات سن اے دوست

نظر اٹھا کہ دو عالم ہیں گوش بر آواز
نوائے دردِ دلِ کائنات سن اے دوست

التفات اندر التفات نہیں
اُن نگاہوں میں اب وہ بات نہیں

ہر خوشی مٹ گئی تو کیا مضطر
غم یہ ہے غم کو بھی ثبات نہیں

دیکھتا ہی سازِ عشرت کو تو سوزِ غم بھی دیکھ
اپنی دنیا دیکھنے والے مرا عالم بھی دیکھ

نگاہِ دوست پہلا سا تغافل بھی نہیں کرتی
مگر دل ہے کہ صرفِ اضطرابِ غم ابھی تک ہے

محبت نے زمانے کو سنوارا اس طرح لیکن
نہ جانے کیوں مزاجِ زندگی برہم ابھی تک ہے

انقلابات سے مٹ جاتا ہے غم کا احساس
بعض اوقات یہ دنیا بھی حسیں ہوتی ہے

پیامِ شوق دیا تھا مجھے کبھی جس نے
مری نظر کو ہے اب تک اسی نظر کی تلاش

جنھیں آشارۂ منزل سمجھتے ہیں جہاں والے
وہی راہِ محبت میں چراغِ رہگذر ہونگے

گمرہی کو شوق کا حاصل بنا سکتا ہوں میں
بیخودی کو رہبرِ منزل بنا سکتا ہوں میں

بحرِ ہستی ان تلاطم خیز موجوں کی قسم
یاس کی ہر موج کو ساحل بنا سکتا ہوں میں

وہ مصوّر ہوں کہ مضطر خونِ دل سے بھر کے رنگ
اک حسیں تصویرِ مستقبل بنا سکتا ہوں میں

جبتک نہ چشمِ دوست اشارا کرے کوئی
کیا فائدہ کہ عرضِ تمنا کرے کوئی

کب تک رہینِ ستم ہائے زندگی
کب تک غمِ فراق گوارا کرے کوئی

جب ہر کشاکشِ غمِ دنیا ہی زندگی
پھر کیوں شکایتِ غمِ دنیا کرے کوئی

چاند تارے خموش، رات خموش
فرش تا عرش کائنات خموش

اس جہانِ سکوت میں کھو کر
ہوتی جاتی ہے اب حیات خموش

بہار:-

مشہود احمد نام، تخلص بہار، تلمیذ حضرت شوخ صاحب برنی، تاریخ پیدائش جولائی سنہ ۱۹۲۸ء مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں تعلیم پا رہے ہیں۔

سوزِ پیہم صرفِ آہِ آتشیں ہوتا رہا
دل میں اک ہنگامۂ حشر آفریں ہوتا رہا

اس طرف پردے حریمِ ناز کے ہلتے رہے
اس طرف کچھ میری نظروں کو یقیں ہوتا رہا

بے زبانی سے تجھے خدا سمجھے
مدعا دل میں رہ گیا دل کا

ذکرِ وفائے دوست پر غیر سے کچھ نہ کہہ سکا
گذری ہوئی حقیقتیں سامنے آ کے رہ گئیں

نزع میں ضبطِ آہ کی لاج نہ رہ سکی بہار
آخری چند ہچکیاں حال سنا کے رہ گئیں

ادراکِ مجاز اصل میں ہے عینِ حقیقت
بتخانہ نگاہوں میں ہے کعبہ مرے دل میں

پیوست ہیں رگ رگ میں غمِ ہجر کے نشتر
ہر سانس ہے مجروح تمنا مرے دل میں

پھر رہا ہے آپ کا دیوانہ یوں بیگانہ وار
جیسے دنیا میں کسی سے بھی شناسائی نہیں

زمانے کی حدوں سے دور رہ کر
تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں

اب تجھ سے تیرے جور کا شکوہ ہی کیا کریں
دل ہی نہیں رہا تو تمنا ہی کیا کریں

اک ایک موجِ غم ہی یہاں بحرِ بے کنار
کشتی نا خدا کا بھروسہ ہی کیا کریں

زباں تک حالِ زارِ غم نہ آئے
نفس ہے بار بار آئے نہ آئے

سراپا اشتیاقِ دید ہو جا
نظر پر پردے کا آئے نہ آئے

سنا تو لیں محبت کی کہانی
بلا سے اعتبار آئے نہ آئے

اڑا لیں آج ہی دل کے بھی ٹکڑے
جنوں پر دورِ بہار آئے نہ آئے

وہ کر رہے ہیں مائلِ عذرِ جفا مجھے
محشر میں مل رہا ہے میرا خوں بہا مجھے

خونِ دل سے سرِ خار کو روشن کر لیں
کچھ تو رنگینِ غمِ تنہائی صحرا ہو جائے

تیرے حضور گذرے جو لمحہ زندگی کا
لاکھوں گنا حسین ہے وہ عمرِ جاوداں سے

پروانہ جلتے جلتے خود شعلہ بن گیا ہے
شاید کہ سن لیا ہے کچھ شمع کی زباں سے

آئینہ وار جلوہ سینہ ہیں چشم و دل
حسن آفریں نگاہ تو پیدا کرے کوئی

قیسی

نام ڈاکٹر جگدیشور چندر بری۔ تخلص قیسی۔ تلمیذ جناب منشی فیض الحسن صاحب جگر بالوڑی

مٹاتے جا رہے ہیں نقشِ پا بھی
گوارا کب ہماری بندگی ہے

یہ رازِ عشق سمجھا ہے تری ناکامِ الفت نے
جہاں آغازِ منزل تھا وہیں انجامِ منزل ہے

بجھی کب آتشِ سوزِ دروں آنسو کی بوندوں سے
بھلا آتش کدہ میں کیا حقیقت اشکِ شبنم کی

یہ مہماں نوازی نہیں ہے تو کیا ہے
ترے درد کو دل کا آواز دینا

[illegible] کفن کو کر کے جاں سوز کا لاشہ
سبق لیں انقلابِ رنگِ محفل دیکھنے والے

عشق کا حال عشق سے پوچھو — سوز کی بات ساز کیا جانے
زخم کو جو لگا دے ہے دل سے — اُس کو نشتر نواز کیا جانے
رات بیمار پہ جو گذری ہے — وہ دلِ چارہ ساز کیا جانے

منظر:-

لالہ حکم چند نام۔ منظر تخلص۔ وطن بلند شہر عمر ۳۵ سال، شاگرد فیض الحسن حجر باپوڑی کے ہیں، اردو زبان پڑھ لکھ نہیں سکتے مگر اُردو میں بے تکان شعر کہتے ہیں۔

سن رہا ہوں ذرہ ذرہ ہر کسی کی داستاں — ہر لبِ خاموش ہے جادو بیاں میرے لئے
اے اجل اک تو ہی کیا عالم کو ہے میری تلاش — ٹھوکریں کھاتے ہیں لاکھوں کارواں میرے لئے
شوخیاں تو دیکھئے بھیجے ہیں ٹکڑے جام کے — میرے ساقی نے بدستِ دیگراں میرے لئے
عشق میں مر کے کہتا ہے کمالِ زندگی — مرگِ ناکامی ہے عمرِ جاوداں میرے لئے
تنگ ہے میری نظر میں وسعتِ دیر و حرم — ہر قدم پر چاہیئے اک آستاں میرے لئے

ہر اک شے میں کسی کا حسن یکتا دیکھ لیتا ہوں — بقدرِ ذوقِ نظارہ تماشا دیکھ لیتا ہوں
لئے پھرتی ہے میری جستجو مجھ کو زمانے میں — ترے صدقے میں عالم کا تماشا دیکھ لیتا ہوں
میری ہمت کہاں بے پردہ حسنِ یار کو دیکھوں — چمن اندر چمن صحرا بہ صحرا دیکھ لیتا ہوں
بھلا یہ چند موجیں کیا بگاڑیں گی مرا منظر — میں ہر طوفاں کے پردہ میں کنارا دیکھ لیتا ہوں

ہر بلائے ناگہاں کو زندگی کہہ لیجئے — مستقل غم کو نشاطِ دائمی کہہ لیجئے
یا تو یہ کہئے کہ ہر شے میں ہمیں ہیں جلوہ گر — یا اسے میرا مذاقِ عاشقی کہہ لیجئے
اپنے بیگانوں کی سب کی سن رہا ہوں بزم میں — آپ کیوں خاموش ہیں کچھ آپ بھی کہہ لیجئے

جب تک حریمِ ناز میں جلوہ گری رہی — دنیا تجلیات میں ڈوبی ہوئی رہی

کس درجہ بیکسی تھی کہ میں دیکھتا رہا ۔ اور برق آشیاں پہ میرے کوندتی رہی
دھوکا نہ دے سکی ہے مجھے دنیائے رنگ و بُو ۔ ہر شے مری نگاہ میں جو تھی وہی رہی
مقبولِ عام ہو کے رہے گا یہ میکدہ ۔ ساقی اگر یہی تیری دریادلی رہی
اِک میں کہ راہِ حق میں بڑھاتا رہا قدم ۔ اک عشرتِ جہاں کہ مجھے روکتی رہی
حل ہو سکا کسی سے نہ عقدہ حیات کا ۔ ہستی ہمیشہ راز تھی اور راز ہی رہی
اس بدنصیب کی کوئی قسمت کو کیا کہے ۔ بزمِ طرب میں بھی جسے آشفتگی رہی

ہر قدم پر موجزن ہوتا ہے بحرِ رنگ و بو ۔ اس طرف سے بھی گزر جاتا ہے طوفانِ بہار
اک ستم آرا خزاں بن کر چمن لوٹا کیا ۔ دم بخود دیکھا کئے سب جاں نثارانِ بہار

ایک ہم ہیں کہ نہیں دل پہ بھی اپنے قابو ۔ ایک تم ہو جسے چاہو، تمہارا ہو جائے
زہر کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں اے منتظر ۔ میرے ساغر میں جو ڈھل جائے تو صہبا ہو جائے

بیتاب ہو رہا ہوں ترے انتظار میں ۔ آجا قرار بن کے دلِ بیقرار میں
محسوس کر رہا ہوں یہ آغوشِ یار میں ۔ دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں
کانٹوں کو گلستاں سے نہ کر باغباں جدا ۔ یہ بھی گلوں کے ساتھ پلے ہیں بہار میں
اُس دِل کی عظمتوں کا بھلا پوچھنا ہی کیا ۔ برباد ہو گیا جو تری رہگذار میں

میں سمجھتا تھا میں ہی مضطر ہوں ۔ وہ بھی ہیں بیقرار کیا کہنا
دینے والے تیرے کرم کے نثار ۔ ایک دِل غم ہزار کیا کہنا
میری تشنہ لبی میں کام آیا ۔ خنجرِ آبدار کیا کہنا
جب وہ سنتے نہیں تری اے دِل ۔ اُن سے پھر اصرار کیا کہنا
پتہ پتہ پہ حسن رقصاں ہے ۔ جوششِ نو بہار کیا کہنا

صدر

رگھبیر پرشاد نام۔ صدر تخلص۔ بلند شہر کے ایک مقتدر علم پرور خاندان کے فرد ہیں، کئی سال تک میونسپل بورڈ کے چیئرمین رہے۔ تین سال سے زبان اور دماغ مفلوج ہو گئے ہیں۔
غزلوں کے علاوہ سیاسی اور قومی نظمیں بھی لکھی ہیں۔
رنگینی، ندرت فکر اور حسن تعلیل ان کے محاسنِ کلام میں سے ہیں ان کا شمار قادر الکلام شعراء میں ہے۔

چھپی برچھی نگاہ سرمگیں معلوم ہوتی ہے
ترے کاتب کی مشق اولیں معلوم ہوتی ہے

سرافراز جو ہیچ پوچھو نشیب دِل کی کیفیت
فضائے آسماں بھی اک زمیں معلوم ہوتی ہے

عدم میں پست کے ذرات پراں ہو کے الجھ بیٹھا
بشر کی بود ہی کیا تھی جو طوفاں سے الجھ بیٹھا

مبدل ہو گئی دِل کی خلش اب دردِ الفت سے
وہ کانٹا چوم لوں جو پائے لغزاں سے الجھ بیٹھا

نہ ڈھونڈے بھی ملینگے اسکے ٹکڑے کیا الجھتی ہو
جو دیوانہ کوئی زنجیر زنداں سے الجھ بیٹھا

خجل اعمال سے ہوں اب اٹھائے بھی نہیں اٹھتا
یہاں تو ہاتھ کیا سر بھی گریباں سے الجھ بیٹھا

آلودہ رہروانِ عدم ہیں گناہ سے
بچتا نہیں سفر میں کوئی گردِ راہ سے

دِل کی کلی کھلی نہ تبسم کناں ہوا
غنچہ صفت میں گلشن امکاں میں رہ گیا

محشر میں ہو رہی ہے عناصر کی چھان بین
ذرہ جو اک فضائے پریشاں میں رہ گیا

رفعت جو دیکھ لے درِ عالیجناب کی
ٹوپی فلک کے سر سے گرے آفتاب کی

گرمی رگوں میں کم جو ہوئی اضطراب کی
ساحل پہ نبض چھوٹ گئی موجِ آب کی

ذرا ہلنے پی کے ایک پیالی شراب کی
کھو دی کلید ہاتھ سے جنت کے باب کی

الفت پہ روک ٹوک نہیں رعب داب کی
ذرّوں کو چومتی ہے کرن آفتاب کی

کبھی اس طرف کو سرک گئی کبھی اس طرف کو سرک گئی
نفس ایک رہ ہی رہ گئی جو میانِ صدر اٹک گئی

کہیں کچھ نہ تھا جب ازل کے روز ضیائے حسن چمک گئی — یہ جہان ذروں کی بھیڑ ہے جو تلاش حسن میں تھک گئی
لگی آگ خرمن آرزو کو نہ برق حسن سے کیا ہوا — کبھی نالہ بنکے کڑک گئی کبھی درد بنکے چمک گئی
دل درد مند کو کچھ ایسی ٹھیس لگائی ہر دم سرد نے — کہ کلی کو دیکھ کے رو دیا جو صبا کی زد سے چٹک گئی

روح لطیف اور یہ کالبد عناصری — بھول کے مرغ پھنس گیا دام نظر فریب میں
بحر جہاں میں جا رہو جس لوٹ گئے سہارے سطح — گوہر بے بہا رہا محو بہت نشیب میں
صد رنگ ہیں اس میں از پئے صد رنگ ہیں مصلحت — کانٹوں کے ہاتھ میں ہر گل کانٹے ہیں گل کی جیب میں

جلا ڈالا کہ ہے سوز نہاں سوز نہاں پھر بھی — یہ ضبط شمع ہے رکھتی نہیں گو یا زباں پھر بھی
ہجوم عشق تاب جلوہ ہائے حسن کیا لائے — کہ خرمن پھر ہے خرمن بجلیاں ہیں بجلیاں پھر بھی
نہیں دیکھا مگر موجوں کی رو سے یہ سمجھتا ہوں — کہ ساحل کوئی رکھتا ہے بحر بیکراں پھر بھی
تڑپ کر توڑ تو دوں سلسلے زنجیر ہستی کے — عدم سے کھینچ لائیں گی مگر بے تابیاں پھر بھی
احبا بھول کر بھی سوئے گورستاں نہیں آتے — وہ شاید یوں نہیں آتے کہ آنا ہے یہاں پھر بھی
پرستاران سیم و زر غلامی پھر غلامی ہے — زری ہوں نقرئی ہوں بیڑیاں ہیں بیڑیاں پھر بھی

صوفی

(رنگیشور دیال صاحب ایم۔اے۔ ال۔ ال۔ بی)

رنگیشور دیال نام۔ صوفی تخلص۔ بلند شہر کے ایک ممتاز علم پرور کالیستھ خاندان کے فرد ہیں اسی ضلع میں نائب وکیل سرکار کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صلح کل طبیعت، حقیقت نگر نگاہ پائی ہے ان کی طرز فکر کا صحیح ترجمان ہے۔ آپ انجمن "فروغ ادب" بلند شہر کے صدر ہیں

کثرت سے دور بھاگ نہ وحدت کے خواستگار — کثرت کے ذرہ ذرہ میں وحدت کا راز ہے
رہ رہ کے پوچھتا ہے مرا دل یہ بار بار — بیگانہ و یگانے میں کیا امتیاز ہے

ناکامیاں بھی باعثِ کلفت نہیں مجھے — کچھ اُس کی مصلحت ہی کوئی اس میں راز ہے
مجھ کو تمام عمر رہی فکرِ حل مگر — قدرت کا راز آج بھی سربستہ راز ہے
جو آشنائے درد نہیں ہو وہ دل نہیں — ہے درد ہو دل کی شرط یہی دل کا راز ہے
مدِّ نظر ہے خدمتِ خلقِ خدا مدام — ہے بندگی یہی - یہی اپنی نماز ہے
پیدا کیا ہے جس نے بھروسہ اسی پہ ہے — روزی رساں وہی ہے وہی کارساز ہے
دامن کسی کے سامنے پھیلے نہ جیتے جی — صوفی یقیں کر کہ خدا کارساز ہے

ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہی جسکو حسنِ دوست — وہ جہاں میں بے نیازِ کعبہ و بتخانہ ہے
جسمیں جتنی ہی شرافت اُسقدر جھکتا ہے وہ — انکساری درحقیقت ظرف کا پیمانہ ہے

حقیقت کا اگر آنکھوں میں پیدا نور ہو جائے — نظر جو آ رہا ہے سب نظر سے دور ہو جائے

مجھ کو دیوانہ سمجھتے ہیں اگر سمجھا کریں — ہوش اپنی منزلِ مقصود کا رکھتا ہوں میں

آئے تھے دنیا میں دو دن کو تماشہ دیکھنے — خود تماشہ بن گئے کس کا تماشہ دیکھئے
چار دن کی زندگی پر اس قدر مغرور ہے — آدمی کو گر بقا ہوتی تو نقشہ دیکھتے

زمیں بھی وہی ہے وہی آسماں ہے (رباعی) جو پہلے تھا اب بھی وہی درمیاں ہے
مگر ہیں جو پہلے تھا، اب وہ نہیں ہوں — میرے گلستاں میں بہارِ خزاں ہے

جلوہ فرما سامنے ہی وہ حسیں ہوتا رہا — اور میں صرفِ نگاہِ دور بیں ہوتا رہا
اُن کا نظارہ بوقتِ واپسیں ہوتا رہا — جو تماشہ حشر میں ہوتا نہیں ہوتا رہا
جان پروانہ نے دیکر جان تازہ ڈال دی — صبح تک محفل میں شورِ آفریں ہوتا رہا
داد ادھر بیداد گر کو ظلم کی ملتی رہی — اور اُدھر بسمل پہ چینِ نکتہ چیں ہوتا رہا

مشورہ دیتا ہوں سب کو نام ہے میر ضمیر — کوئی جب سنتا نہیں خاموش ہو جاتا ہوں میں

برق:-

سید ذوالفقار علی نام۔ برق تخلص۔ سید افضل علی آبرو مرحوم کے پسر اصغر ہیں، شاعری میں اپنے بھائی جناب یاراں سے مشورہ لیتے تھے، کچہری کلکٹری بلند شہر میں کام کرتے ہیں عمر ۵۵ سال ہے۔

آبرو یاراں سے ملی ہے شاعری ورثہ میں برق — کیوں نہ دکھلائیں غزل میں رنگ استادانہ ہم

ستم ہوتا، کرم ہوتا، برا ہوتا بھلا ہوتا — اسیرانِ بلا کا الغرض کچھ فیصلہ ہوتا
گلستانِ دو بالا وشل پر پرواز ناکارہ — قفس سے ہم اگر آزاد بھی ہوتے تو کیا ہوتا

در پردہ ہو رہی ہیں جو ہم پر عنایتیں — ہیں التفاتِ خاص کے انداز پائے کون؟
ہم دل کو آشنائے حقیقت بنا تو لیں — لیکن انہیں مجاز کی دنیا میں لائے کون؟

زباں سے تم اپنی گنہگار کہہ دو — ہمیں اپنی تسلیم ہیں سب خطائیں
جدائی کی منزل قریب آ رہی — پہنچ رہی ہیں قفس کی صدائیں

کیفِ نظارہ ہم اٹھا نہ سکے — ان کے جلووں کی تاب لا نہ سکے

کچھ تو دے لوں کل کی توبہ کا جواب — ساقیا لانا مرا جامِ شراب
روئے رنگیں ہے چمن اندر چمن — زلفِ مشکیں ہے سحاب اندر سحاب
جلوہ فرما ہے بہار اندر بہار — یا عذارِ گل فروش اندر نقاب
ہے لبِ لعلیں پہ موجِ ابتسام — برگِ گل کھانے لگے یا پیچ و تاب

سوائے درد کے اب کوئی چارہ ساز نہیں — ترا خیال بھی مدت سے دلنواز نہیں

جب ہم دنیا پر ہنستے تھے اب دنیا ہم پر ہنستی ہے — وہ عشق کی پہلی منزل تھی یہ غم کی پہلی منزل ہے
بربادیٔ دل کا افسانہ ہے نازک نازک ہونٹوں تک — جب مٹنے والا مٹ ہی چکا اب اس کا ماتم لاحاصل ہے

آنکھ جو دید کو ترستی ہے — اپنے ذوقِ نظر کی پستی ہے

عشق کی ان جبارتوں پہ نہ جا — حسن کی بھی تو سرپرستی ہے
آج اُن کی نگاہِ صبر شکن — پھر کسوٹی پہ دل کو کستی ہے
برق اب تو غمِ محبت بھی — شکوہ پیرائے تنگ دستی ہے

ہر ایک تنکے سے پیدا اک آشیاں کیجے — نہیں تو آگ لگا دیجے آشیانے کو
شرابِ غم کے تلاطم کی وسعتیں توبہ — میں ایک موج سمجھتا ہوں کل زمانے کو
جبینِ برق کو ٹھکرا نہ اس طرح اے دوست! — یہ آستانہ بناتی ہے آستانے کو

یوں تو اکثر آتے رہتے ہیں محبت کے پیام — آپ بھی آ کر کبھی تسکین فرمایا کریں

شورشِ عشق ہے حلال لذتِ عشق ہے حرام — ہم نہیں چاہتے کہ درد کی مشکلات میں

اللہ رے قفس میں تصور کا یہ کمال — رہ کر بھی دور دور نہیں آشیاں سے ہم
اعجازِ جنبشِ نگہہ شوق دیکھنا — وہ کہہ گئے، جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

دل کے ہر ذرہ میں خود جذب ہوئے جاتے ہیں — اور پھر مجھ سے یہ کہتے ہیں مجھے یاد نہ کر

یوسف جمال :-

یوسف جمال صاحب انصاری، ولد قاضی محمد عارف صاحب مرحوم۔ جیور کی شعر پرور سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، علیگڑھ یونیورسٹی سے انگریزی میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا، اسوقت اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار ہیں۔ زبان میں لطافت ہے۔ تخیل میں رنگینی، جذبات میں شدت۔

چھائی ہیں دشت و در پہ گھٹائیں بہار کی — بن کر نویدِ رحمتِ پروردگار کی
گل ساغر بکف ہے، کلی گوشِ منتظر — کب سے ہے تیری دھن میں فضا لالہ زار کی
تجھ پہ گھلائے حسن ملاحت صبا نے لوچ — کلیوں نے رس، شراب نے مستی نثار کی
آواز میں ربابِ شکستہ کی لرزشیں — شوخی قدم میں جوئے سرِ کوہسار کی

موجِ گہر کی آب ہی، قوسِ قزح کا رنگ
غلطاں ہے چشمِ مست میں ذوقِ رسیدگی
اے تو کہ تجھ پہ ایک نظر میرے واسطے
آجا پیامِ شوق و مسرت لئے ہوئے
تاخیر کر نہ یارِ مسیحا نفس کہ اب
تمثیلِ رنجِ ہجر ہوں دنیائے عشق میں
غم نے جو صبر و ہوش کا دامن جھٹک دیا
ہے کونسی جگہ تجھے ڈھونڈا جہاں نہیں
آفت ہے سیلِ ماہ، بلا ہے بہارِ گل
یہ آسماں پہ ابر کے ٹکڑے نہیں ہیں دوست
قربان دردِ عشق کے جھولے سے بھی کبھی

دیکھے قیامتیں کوئی رخ پر نکھار کی
ابھری ہوئی لبوں پہ تمنا ہے پیار کی
توصیف ہے کرشمۂ پروردگار کی
دنیا بدل نہ دے دلِ بے اختیار کی
ہونٹوں پہ جان ہے ترے امیدوار کی
تصویر بن گیا ہوں ترے انتظار کی
مایوسیوں نے وضعِ جنوں اختیار کی
چھانی ہے خاک تیرے لئے ہر دیار کی
فرقت میں ایک ماہ جبیں گلعذار کی
پرچھائیاں ہیں میرے دلِ سوگوار کی
آئی نہ مجھ کو یاد غمِ روزگار کی

رات ہو جائے گی باتوں میں تمام
جلوہ آرا وہ ہوئے بالائے بام
جن کو چشمِ مست سے مل جائے دام
امتحانِ شوق کب تک، اب بھی جا
خوفِ رسوائی سے دل سہمے ہوئے
مستیٔ اندازِ ساقی ہے کہ مے
انتہائے عشق سے ڈرتا ہوں میں
ساقیا! صدقہ نگاہِ مست کا

اک ذرا سن لو مجھے ہے تم سے کام
یا فضا کی گود میں ماہِ تمام
مے وہی ہے جام اے ساقی وہ جام
تابکے امروز و فردا، صبح و شام
آنکھوں آنکھوں میں محبت کے پیام
ظرفِ رندانِ بلاکش ہے کہ جام
نقشِ حسنِ دوست ہیں یارب دوام
جان سے جاتے ہیں تیرے تشنہ کام

حشر تک تاریخ دہرانے کو ہے — عشق ہم دونوں کا، ہم دونوں کے نام
الفراق اے تو کہاں اور ہیں کہاں — الوداع اے شہر خوباں السلام
منہ ساقیٔ کوثر کو دکھانا ہے تجھے — حور باغ حوران ارم سے دل لگانا ہے تجھے
اس دیس کی ریت سیکھ لے او غافل! — جس دیس کو تا آبد بسانا ہے تجھے
مدت سے اٹھا رہا ہوں غم ہستی کا — اک عمر سے کھا رہا ہوں سم ہستی کا
دے بادہ کہ قبل رگ و انصاف و جزا — ساقی چکھ لوں میں کیف و کم ہستی کا

شفیق

منشی مہدی حسن شفیق ربانی خلف الصدق قاضی منشی نبی بخش ساکن قصبہ جہانگیر آباد شاگرد رشید حضرت رسا سکندر آبادی۔ ان کے اشعار کی گھٹا میں سے کہیں کہیں ندرت فکر کی سہی للکیر پھوٹ نکلتی ہے۔

نہ کیوں ذوق جراحت دم بھرے انکے نمکداں کا — نہیں بدلا مزا ابتک دہان زخم پنہاں کا
ہوئے ظلم ليں وحشت کی ساری چاک دامن تک — رہے دست جنوں کا راہبر چاک گریباں تھا
رہائی جان دینے پر بھی کشتوں کو نہیں ملتی — اسیر ذوق قاتل ہی تماشا رقص بسمل کا
رہین رنگ چمن قلب داغدار نہیں — یہ لالہ وہ ہے کہ جس کو غم بہار نہیں
وہ کرے حد بندیاں کس کس کی اک تار رفو آخر — ہزاروں راستے وحشت کے ہیں چاک گریباں میں
تلے ہیں وعدہ خلافی کی وہ تلافی پر — وہ سن رہا ہوں جو دشمن کے بھی گماں میں نہیں
وہ کیا شے تھی جو اے سفاک تیرے پاس نکلی — تیرا ارمان نکلا یا مری جان حزیں نکلی
مری قسمت کہ رہتی ہیں بہاریں بھی خفا مجھ سے — رگ گل بھی گلستاں میں تری چین جبیں نکلی
حوصلے کس طرح نکلیں گے دل تجھ سے — پہلے تیور تو سنبھل جائیں تمہارے تیر کے

کیا عطا کر دی ہیں پیکاں کو اجل کی قوتیں
سانس بھی لیتے نہیں زخمی تمہارے تیر کے
رنگ خونِ آرزو ہے غازے سے لئے شفق
کس قدر رنگیں ہیں پر تو حسرتِ دلگیر کے

ہر اک ذرّے میں برق بے اماں معلوم ہوتی ہے
ترے در کی زمیں بھی آسماں معلوم ہوتی ہے

محبت میں ہمیں شغلِ جنوں ایجاد کرنا ہے
نظر کی جنبشوں کو تیشۂ فرہاد کرنا ہے

فراقِ عشق کی توہین ہے سجدہ کناں ہونا
کمالِ غم سمجھتا ہوں سراپا آستاں ہونا

یہ مختصر سا ہے قصّہ دلِ شکستہ کا
تمہاری بزم سے اٹھنا عذاب ہوتا ہے
قدم اٹھانا بھی مشکل ہے کثرتوں میں شفق
کہ ذرّہ ذرّہ مرا ہم رکاب ہوتا ہے

دیکھا ہے جب سے اس مہ خوبی کو خواب میں
اک چاندنی سی ہے دلِ خانہ خراب میں

زخموں میں تازگی سی یہ کیسی ہے اے شفق
شاید بہار آئی دلِ داغدار میں

اثرؔ

پرمانند سروپ صاحب اثرؔ سکندرآباد کے مشہور کایستھ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ شائستگی ان کے گھرانے کی کنیز ہے، آدابِ مجلسی ان کی محفل میں خدام کی طرح صف بستہ رہتے ہیں، اس خاندان میں صدیوں سے شعر و شاعری کا چرچا ہے ۔ اثرؔ صاحب وجیہہ، بیدار مغز اور حلیم الطبع انسان ہیں۔

رباعی

کیا زیست کی کائنات اتنی ہے فقط
ہو جلد تمام بات اتنی ہے فقط
جاگا جو اثرؔ تو بس سویرا پایا
کروٹ بھی نہ لی تھی رات اتنی ہے فقط

مشکل دینا درم کا آسان سر کا
ہے بخل تو اک غلام ان کے در کا
کیوں نہ سیاہ اصل زر کا دل بھی
کالا کرتا ہے ہاتھ چھونا زر کا

کمالِ حسن و عروجِ شباب دیکھ لیا
جو سب نے دیکھا وہ ہم نے بھی خواب دیکھ لیا
جہاں کو مست کیا آپ کے تصوّر نے
بغیر بادہ کے کیفِ شراب دیکھ لیا

ساقی تری باتوں سے نیت مری کیا بھرتی
پیمانہ کو کم سے کم لب تک تو بھرا ہوتا

اے خضر مجھے مارا جس بادۂ الفت نے
اک جامِ فنا اس کا تم نے بھی پیا ہوتا

دم بہ دم دیتے ہو غم کہتے ہو پھر اپنا مجھے
یہ تمھیں زیبا ہی شکوہ ہے یہ نازیبا مجھے

پھر وہ مجھ سے آ ملے پھر آرزوئیں جی اٹھیں
پھر نظر آنے لگی دنیا ہی دنیا سب مجھے

پیتی ہے آسیا بن کر نہیں معلوم کیوں
گردشِ گردوں نے سمجھا کیا کوئی دانا مجھے

کر دیا تھا عشق نے جب سے ہی گم کردہ راہ
فرطِ غم نے پھر اداسی عالم میں پہونچا دیا مجھے

چین سے سوئی ہوئی تھی میری قسمت میرے ساتھ
تم نے سمجھا تھا شبِ فرقت میں کیا تنہا مجھے

طالبِ دید کیلئے جلوۂ دید ہے سہل
میری نگاہِ شوق کیا حسن کی پردہ در نہیں

وادیٔ ذوق و شوق میں اب وہ مقام آگیا
راہ ہے بے نشاں جہاں کوئی بھی راہبر نہیں

سنیئے غمِ فراق کو وقت نکال کر کبھی
یہ ہے طویل داستاں قصہ مختصر نہیں

اپنے مریضِ عشق کی آپ کو کچھ خبر بھی ہے
اب ہے یہ کیفیت کہ بس شام نہیں سحر نہیں

اسیر

امیر احمد نام۔ اسیر تخلص۔ وطن گلاوٹھی۔ آجکل میرٹھ کورٹ آف وارڈس میں ضلعدار ہیں اس ضلع کے اساتذہ میں شمار ہے۔ اشعار پختگی اور کہنہ مشقی کا اعلان کر رہے ہیں۔ فکر کا وزن تخیل کی لطافت سے تکلف ہے

[illegible] کا کیا ہے اگر موافق ہوا نہیں ہے
نہیں تک آ سکی تو دسترس تجھ ناخدا ہی خدا نہیں ہے

ستم کی باریکیاں ہیں کہ رقصِ بسمل پہ وہ یہ بولے
اگر لہو کی اڑیں نہ چھینٹیں تو یہ تماشا ہی کچھ نہیں ہے

حسن سے پوچھئے اعجازِ محبت کے کمال
میں بقول آپ کے دیوانہ ہوں میں کیا جانوں

اتنا تو بتا دے مجھے اے دیدۂ پر شوق
جب وہ نہیں موجود تو کیا دیکھ رہا ہوں

یہ آسماں تو بدلتا نظر نہیں آتا
زمیں ہی اور بنا لوں اس آسماں کیلئے

قدم قدم پہ جنھیں لغزشیں ستاتی ہیں
خدا کی شان ستوں ہے وہ آسماں کیلئے

چمن سے گل بگو بیاں وہ آ رہے ہیں امیر
الٰہی خیر یہ تیاریاں کہاں کیلئے

انھی بلائیں بھیج کہ کاٹے نہ کٹ سکیں
اے چرخ آج میری امیدوں کی رات ہے

وہ ڈھونڈتے ہیں نشیمن میرا نہیں ملتا
خدا کی شان کہ اب بجلیاں بھی پاس نہیں

یہ ناخدا کا تصرف ہے یا خدا کا کرم
سفینہ ڈوب چلا اور مجھے ہراس نہیں

نہ قیام کا سلیقہ نہ شعور خانماں ہے
جہاں دیکھے چار تنکے وہیں سمجھے آشیاں ہے

اس نے دل کا تذکرہ چھیڑا کچھ اس انداز سے
میں یہ سمجھا پھر بلا آئی کوئی دل کے لئے

اگرچہ لاکھ زمانے نے کروٹیں بدلیں
مگر جنوب کو اب تک شمال کر نہ سکا

خمار

نجم الحسن صاحب خمار بی۔اے۔ ڈبائی آپ کا وطن ہے۔ زندگی کی بیسویں منزل میں ہیں۔

آواز دی سکون دو عالم نے بار بار
جب تیرے غم کی گود میں نیند آ گئی مجھے

ہم نے اکثر تری محبت میں
جان کر ہی فریب کھائے ہیں

وفورِ درد میں تسکین پا رہا ہوں میں
ضرور آج انھیں یاد آ رہا ہوں میں

دفعتاً جب عہد رفتہ کا خیال آیا مجھے
میں یہ سمجھا جیسے تم نے یاد فرمایا مجھے

کبھی پردہ اٹھاتے ہیں کبھی پردہ گراتے ہیں
وہ ہر انداز سے ذوق نظر کو آزماتے ہیں

خدا جانے وہ میری غم بھری حالت پہ کیوں ہنستے ہیں؟
انھیں کا یہ کرم ہے اور وہی آنسو بہلاتے ہیں

اے حرارتِ نگاہ الٹ دے نقاب دوست
شعلوں سے کھیلنا ہے تو دامن بچائے کون؟

تم کیا گئے نظام دو عالم بدل گیا
تاروں کی انجمن میں بھی تابندگی نہیں

انھیں دیکھ کر اشکِ غم بہہ نہ نکلیں
محبت کا سارا بھرم کھل نہ جائے

ستاروں کی چلمن سے جب تم نے جھانکا
دو عالم تمھیں دیکھ کر مسکرائے

محبت کی بہت رنگیں کہانی ہے جہاں ہم ہوں
شکستِ عشق میں بھی کامرانی ہے جہاں تم ہو

قطعہ

پایا ہے ہر صورت انکو فطرت کے حسیں شہکاروں میں
کلیوں میں سحر میں شبنم میں خورشید میں لالہ زاروں میں

وہ لاکھ چھپیں مجھ سے لیکن میں دیکھ ہی لیتا ہوں انکو
باغوں کے شگفتہ پھولوں میں راتوں کے درخشاں تاروں میں

تو نے فضائے دہر کو کیفِ دوام دے دیا
تیرے بغیر کچھ نہ تھا دامنِ کائنات میں

ولی :

نام منشی ولی محمد خاں۔ ولی تخلص۔ عمر ۸۰ سال، وطن اورنگ آباد ضلع بلند شہر۔ طالب اورنگ آبادی سے شاعری میں مشورہ لیتے تھے۔

یہ اپنی یاد کا اچھا صلہ دیا تو نے
مجھے بھی یاد سے میری بھلا دیا تو نے

مانا کہ میرے پاس جبینِ نیاز ہے
لیکن خطا ہے یہ کہ مجھے اس پہ ناز ہے

دلبستگی نہیں تو حقیقت بھی کچھ نہیں
دل لگ گیا تو رشکِ حقیقت مجاز ہے

دیکھتا ہے در و دیوار میں جلوہ تیرا
رکھ لیا ہے تجھے آنکھوں میں تماشائی نے

بیخودی رازِ بقا ہے اسے چھوڑیں کیونکر
فانی دنیا کی ہے معلوم حقیقت ہم کو

اک نظر ڈال کے بیہوش ہوئے جاتے ہیں
دیکھنے کو تمھیں ہم آنکھ کہاں سے لائیں

وہ خود رفتہ ہیں راہِ عشق میں ہم
کہ ملنے پر بھی اس کو ڈھونڈھتے ہیں

تابشِ حسن سے جلنا بھی تو ہے فخر کی بات
طور ہر طور خلایق کی رہا آنکھوں میں

بتا تو دے کہ تیری جستجو کی
کوئی حد بھی ہے میں جاؤں کہاں تک

متاعِ دین و ایماں بتکدہ میں نذر ساقی کر
کہ ہشیاری سے مستوں میں گذارا ہو نہیں سکتا

ہم ہیں تو اب نظر بھی اٹھانے کا دم نہیں
تیرے حریمِ ناز کے پردے اٹھائے کون؟

دیر و کعبہ میں ڈھونڈھئے اُس کو   مل ہی جائے گا وہ کہیں نہ کہیں
کچھ پتا تو ہے اُن کے کوچہ میں   ہو ہمارا دلِ حزیں نہ کہیں

ہُوا فاش سب رازِ انجامِ ہستی   فنا تک مری داستاں آتے آتے

نہیں ہے چین دم بھر حاسدوں کو   بھلا ہونا کبھی دنیا میں بُرا ہے

میری وحشت بھی چھین لی تم نے   اب نہیں کوئی مشغلہ دل کا

جہاں اے چارہ گر تو نے ابھی نشتر لگایا ہے   چلا کی ہیں نگاہِ ناز کی چھریاں یہیں سوں

حصر آئینہ و نرگس پہ نہیں   جو تمھیں دیکھے گا حیرت ہو گی

کان میں غیر کے ہر بات کو جا پھونکتی ہیں نہ   اب تو نالے بھی مرا ناک میں دم کرتے ہیں
آگ لگ جائے تری شعلہ مزاجی کو کہ تو   بھڑک اُٹھتا ہے جو ہم چشم کو نم کرتے ہیں

مثالِ نفس خانۂ دل کے اندر   انھیں ایک عرصہ ہوا آتے جاتے

قطرہ لہو کا بھیل کے دامن میں رہ گیا   بجھ کر چراغ رونق کا شانہ بن گیا
کانوں سے جا ملا کبھی شانوں پہ جا گرا   سایہ تمھاری زلف کا دیوانہ بن گیا

وہ ناتواں ہُوں میں کہ مرا رشتۂ خیال   اُلجھا ہُوا تصوّرِ موئے کمر میں ہے

طشت میں پائے حنائی رکھ کر   آگ پانی میں لگا دی تم نے

نظروں میں اُن کی تیر و خنجر کیا سما گئے   زخمِ جگر تو اور مری جاں کو آ گئے

غیر کے گھر سے آ کے بیٹھے ہیں   وہ بھی آنکھیں چرا کے بیٹھے ہیں
دیکھئے آج کس کے دم پہ بنے   آستینیں چڑھا کے بیٹھے ہیں

بن گیا تیغ مجھے سر پہ گریباں ہونا   یعنی یہ خو بھی کسی کے کبھی شرماتے ہیں

ہماری چارہ گری بھی تلاش پیکاں ہے   دبا دبا کے جو زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

شانتی:-

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ماہرین سائنس کی صف اوّل میں نظر آتے ہیں، نامور اور خاندانی کالیستھان سکندر آباد ضلع بلند شہر سے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو ذوقِ ادب ورثہ میں اپنے فاضل نانا منشی ہرگوپال تفتہ سے مِلا ہے، جو مرزا غالب کے شاگرد رشید تھے غالب صاحب انکو ازراہِ شفقت مرزا تفتہ کہتے تھے، اُردو ڈاکٹر صاحب کی آبائی اور مادری زبان ہے، یہی نہیں بلکہ زبان اُردو کے ہمدرد اور اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں، صاحب دیوان اور علم دوست ہیں۔ سائنس کی ریسرچ کے سلسلہ میں یوروپ کا دورہ کرچکے ہیں۔ آل انڈیا شہرت کے مالک ہیں، عام طور پر نظم کہتے ہیں۔

زندگی اک موج ہے جس کو نہیں صبر و قرار — خیریت ہے گر دلِ انساں رہے بیتاب سا

سُرخ ہے خونِ بشر شامل ہے اسمیں رنگِ شر — کیا بُرا تھا یہ اگر بے رنگ ہوتا آب سا

ڈرتے رہنا اے نجوم روشنی تو ذرا — چرخ پر ٹوٹا ستارہ جس نے لی رنگت بدل

جلوہ آرائے وطن ہے جو کوئی نورِ جہاں — تب تو کچھ لطف ہے عالم میں جہانگیری کا

تو گوشِ دل سے سُن اپنے ضمیر کی آواز — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا نہ سمجھ

نئے قماش کے قہوے سے بھر مری پیالی — کہ دودھ ہندو کا ہو پانی ہو مسلماں کا

کیا کرے گا ابنِ مریم ایسے مُردے کا علاج — جسکو ضدِ خوابِ راحت قُم کے اصراروں میں ہو

چمن میں خار و گُلِ تر کو تم جُدا نہ کرو — یہ اتحاد ہی تو راز ہے گلستاں کا

بنامِ آتش برادر کے خوں کا پیاسا ہے — سمجھ میں فلسفہ آیا نہ خوئے انساں کا

نہ بجھ سکیں گے یہ شعلے جو گھر میں بھڑکے ہیں — الگ جو ہندو سے پانی رہا مسلماں کا

کوئی ہماری یہ مہماں نوازیاں دیکھے — سپر بھی تیغ بھی سر بھی ہوا ہے مہماں کا

گراتا بجلیاں عالم پہ جب وہ فتنہ زا نکلے — نقابِ ابر میں جاکر چھپے پھر برق کیا نکلے

یہ پیمانِ محبت ہے رہو خاموش ابھی تک ۔۔۔ کہ تنہائی میں بھی منہ سے نہ حرفِ مدعا نکلے
بھرے بیٹھے ہیں گر چھوٹے غضب کا سامنا ہوگا ۔۔۔ خدنگِ ناز؟ کیا معلوم ان چھالوں سے کیا نکلے
میں صحرا کس طرح چھوڑوں کہ کانٹے پاؤں پڑتے ہیں ۔۔۔ مدد اے خوئے تنہائی یہاں بھی آشنا نکلے
مزا پیمائیِ دل کا ہے جب اے دردِ ناکامی ۔۔۔ جو آنسو آنکھ سے نکلے تڑپتا لوٹتا نکلے

بدر :-

قاضی بدر الحسن بدر جلالی۔ بی۔ اے۔ علیگ مد ظلہٗ اُن بے نیاز بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے کبھی شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ گریز کی ہے، اس لئے ادارہ کو ان کی ضخیم بیاض سے جو شعر و ادب کا ایک بے بہا سرمایہ ہے چند اشعار چن لینا بہت ہی دشوار تھا، بمشکل کچھ ردیفوں میں سے شعر جو واقعی منتخب از خود ایسے کہا جا سکتا ہے حاصل کئے ہیں، قاضی صاحب قبلہ روہیلکھنڈ اور دوآبہ گنگ و جمن کے شیوخ اکابر کی یادگار ہیں، ننہال اور ددھیال کی طرف سے نجیب النسل صدیقی ہیں، ۱۸۹۲ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے ننہال ہی میں رہے، اور وہیں تعلیم حاصل کی، فارسی کے ادیب ہیں اور انگریزی کے بی۔ اے، طبیعت انتہائی انقلاب دوست اور حبِ وطن کے سرمایہ بے اندازہ سے بہرہ ور ہیں۔ اس وقت پچپن ۵۵ سال کی عمر ہے لیکن غلامی اور محکومی کے بار نے قبل از وقت پیر ہفتاد سالہ بنا دیا ہے، طبع نازک و لطیف کا یہ تو شعار ہے لیکن جن کا انتخاب بعجلت اور بمشکل کیا ہے، بلند شہر سے چونکہ قدیم تعلق ہے اور حضرت کیف مراد آبادی کے قریب ترین رشتہ دار ہیں، اس لئے بلند شہر والوں کی طرف سے ادارہ یہ لیالی بے بہا نذرِ قارئین کرتا ہے۔

کبھی لا کے پردۂ قدس میں وہ بعین ذات نہاں رہا ۔۔۔ کبھی آ کے بزمِ شہود میں بصفات خاص عیاں رہا
یہ ہستی کا فیضِ عمیم تھا کہ بزیرِ سایۂ پیرِ چرخ ۔۔۔ مری حسرتیں بھی جواں رہیں مرا حوصلہ بھی جواں رہا
میں بھٹک بھٹک کے رہِ وفا میں دیر و حرم پہ جو آ گیا ۔۔۔ تو یہ دلنواز صدا سنی ارے بے وفا تو کہاں رہا

سارے حریم ہست کے ساز بنے ہیں بام و در — نغمہ فضا میں بھر گیا کون ہے لے نواز کا

پریشاں کاریاں میں داغ دل کی بھول جاتا ہوں — بکھرنا یاد آجاتا ہے جب شیرازۂ گل کا

رہنے دو میرے قصۂ غم کو — اک طوالت ہے مختصر ہونا
یہ بھی تقدیر کی ہے پرکاری — انجمن میں تری گذر ہونا

جب تک کہ نگوں چرخ کا ڈیرا نہیں ہوگا — میری شب فرقت کا سویرا نہیں ہوگا
جی بھر کے گل و خار سے مل لے کہ چمن میں — دیوانے ترا پھر کبھی پھیرا نہیں ہوگا

اس طرح بند کیا مجھ پہ در اپنا گویا — سائل محض تھا میں بندۂ مجبور نہ تھا

اک بت کی نگاہوں سے ٹپکتا تھا عجب نور — اے شیخ حرم وہ ترا ایماں تو نہیں تھا
کل موج ہوا پھرتی تھی سینے سے لگائے — اے بدر وہ تیرا ہی گریباں تو نہیں تھا

ساری بہار اپنی گذری ادھیڑ بن میں — اک آشیاں اجاڑا اک آشیاں بنایا

آشیاں کی کسی میں بو بھی نہیں — تنکا تنکا چمن کا دیکھ لیا
ہم نے صبح وطن کے تارے میں — دل غریب الوطن کا دیکھ لیا

داستان حسن و محبت کی بدل ہی جاتی — دست یوسف میں جو داماں زلیخا ہوتا

فطرت وحشت کو یوں دھوکے دئے جائیں گے کیا — فصل گل میں بھی گریباں ہم سئے جائیں گے کیا
حشر میں بھی کیا اسی صورت سے ہوگا فیصلہ — دادخواہوں کے دہاں بھی منہ سئے جائیں گے کیا

تیرے صدقے گردش لیل و نہار — لا کبھی تو پھیر کر عہد شباب

بادۂ رنگیں سے دھلوا لو اسے اچھی طرح — کر دیا واعظ نے آ کے سارا میخانہ خراب
اتنی ہی مے بھی کھنچے گی تیز اور پاکیزہ تر — جس قدر ہو جائے گا انگور کا دانہ خراب

ہے بھی کہ نہیں دیکھ تو ایمان سلامت — اس باغ سے تو لے کے چلا جان سلامت

کیا بھول گیا بدر تو آداب جنوں بھی — یہ موسم گل اور گریباں سلامت؟

نہ موذن ہی پکارا نہ کوئی مرغ سحر — آج کیوں بیٹھ گئے سب کے گلے آج کی رات

صیاد کی نظر سے نشیمن بچا تو یوں — برق و خزاں کے شورش صیاد کا کیا علاج

رکھتا ہوں اپنی ہستی ہنگامہ کوش پر — رکھا ہے اک جنازہ زمانے کے دوش پر

انجمن میں تری کن آنکھوں سے آکر دیکھتے — جابجا اڑتی ہوئی خاکستر پروانہ ہم

شمع کو روتے ہوئے دیکھا تمھاری بزم میں — اُسے عشرت کدہ سمجھیں کہ ماتم خانہ ہم

سید حامد:-

والد کا نام حافظ سید مہدی حسن، مراد آباد وطن، فیض آباد مولد (مارچ سنہ ۱۹۲۰ء) علیگڈھ یونیورسٹی سے انگریزی اور فارسی میں ایم۔ اے کیا، جون سنہ ۱۹۴۳ء میں پراونشل سول سروس میں داخل ہوئے۔

آگے تھا محبت کا گماں سو وہ یقیں ہے — بیتابی دل ہائے یہ بے وجہ نہیں ہے

مخمور نگاہوں سے شوخی کی تراوش ہے — آنکھوں میں جھلکتی ہے جذبات کی گہرائی

الفت بھی شرارت بھی مستی بھی ندامت بھی — یکتا ہے یگانہ ہے یہ انجمن آرائی

کل آپکو ہمنے دیکھ لیا، کل آپ سے آنکھیں چار ہوئیں — تھیں مدت کی پیاسی مدت سے سیراب ہوئیں سرشار ہوئیں

شرمیلا سبک دوپٹہ زیب گلو مخمور سی آنکھوں میں جادو — نازک نازک مثل سبو عارض پہ نگاہیں بار ہوئیں

اظہار سے ڈرنا کیا معنی کیا خوف بھنور میں ہے کشتی — ناؤیں ہیں انوکھی الفت کی جو ڈوب گئیں سو پار ہوئیں

اخفائے شوق دید کا ساماں نہ کر سکے — چھپا تو لی نظر پس مژگاں نہ کر سکے

شایان وصل یار نہیں جو بہار میں — دامن سے اتصال گریباں نہ کر سکے

چھالے ہیں تیرہ روز جنھیں صاحب جنوں — چشم و چراغ خار مغیلاں نہ کر سکے

میں نے کہا کہ آپ عدیم المثال ہیں — وہ مسکرائے لب سے مگر "ہاں" نہ کر سکے

با ایں ہمہ طلاقتِ گفتارِ ناصحا — حامد کو ہیں روش سے گریزاں نہ کرسکے

میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا، انکی نظر نے دیکھ لیا — آنکھیں نادم، روح فروزاں، رشکِ قمر نے دیکھ لیا
روح ہے شاداں، خنداں، رقصاں، آج تو حامد نے بیٹھے بیٹھے — میری شبِ تاریک کی جانب چشمِ سحر نے دیکھ لیا
پندار و عزم و ضبط گرے ایک وار میں — شورش بلا کی تھی نگہِ فتنہ کار میں
ان کو خبر نہیں ہے کہ عشاقِ دور گرد — رکھتے نظر ہیں نور پہ جلتے ہیں نار میں

ستم ہے اب بھی نہ چھوڑے ہے جو اتباعِ نظر — یہ دل کہ جسکو نظر نے بہت دیے ہیں فریب

اصرارِ بے محل سے ادھر یاں حیا سے ہم — اک جاں کشیدہ آپ ہیں اک جاں خفا سے ہم
ہونے لگیں کشف شبہات منعکس — باز آئے آبگینۂ دل کی صفا سے ہم
منظور ہو تو آج بدل لیں بہم دِگر — تنگ آ گئے ہیں آپ جفا سے وفا سے ہم

دل سے ہے دل کو نامہ و پیغام — آنکھ سے آنکھ بدگماں کیوں ہو
راز داں گر نہ ہو تو راز اپنا — راز رہ جائے داستاں کیوں ہو
گر نہ حامد میں ہو کوئی جوہر — گوشۂ چشم گل رخاں کیوں ہو

فروزاں ازل سے رہ جستجو میں — قمر اور بھی کہکشاں اور بھی ہیں
شرارت بھری نیلگوں پتلیوں کو — جو دیکھے کہے آسماں اور بھی ہیں

خود ہی آغوش کھولتی ہے کلی — چھیڑتی پھول کو صبا کب ہے؟
ایک اخفا میں سینکڑوں اظہار — سحر پُرکار ہے حیا کب ہے؟
آنکھ شاہد ہے آرزو دل میں — آپ کی دید کے سوا کب ہے

اشک دیکھیں تو دکھا دیں گوہرِ تابندہ تر — مسکرا دیں دُرِ مژگاں کی بہا کو کیا کریں

بہ قدرِ ظرفِ نظر ہے جدھر کو دیکھتے ہیں — کسی کے دل کو کسی کے جگر کو دیکھتے ہیں

پھنسی ہے جان تذبذب میں نو اسیر ترے
کبھی جبیں کو، کبھی سنگِ در کو دیکھتے ہیں

نظر ہیں جن کی نہیں ہر مژہ کا سرمایہ
صدف میں کاسۂ گل میں گہر کو دیکھتے ہیں

خفا اگر ہیں زباں کو نہ دیجیے تکلیف
یہ کم دماغ مزاجِ نظر کو دیکھتے ہیں

گئے ہیں جب سے یہ پہروں ہے شغل اپنا
خموش بیٹھے ہوئے اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جنوں ہے خام بیاباں کی راہ میں رک گئے
پلٹ پلٹ کے جو دیوار و در کو دیکھتے ہیں

مفقود ہیں گل، خاکِ نشیمن ہے فضا میں
بجلی کا بھی احسان ہے گلچیں کے علاوہ

ابواب کئی اور ہیں رودادِ چمن میں
آوارگیٔ نکہتِ نسریں کے علاوہ

شاطر پہ یہ اس دور کی سرخی سے کھلا راز
دنیا میں پیادے بھی ہیں فرزیں کے علاوہ

جامہ یہ کسی شوخ خود آرا کا ہے پرتو
دل صرف نمائش بھی ہے تزئیں کے علاوہ

اصلِ تعلقات کو جب دیدیا جواب
اخلاق کا سوال بھی کیوں درمیاں رہے

دیکھا جنھوں نے طرفِ حریفانِ میکدہ
دائم سبو و جام سے بھی بدگماں رہے

حجرؔ:-

نام منشی فیض الحسن۔ حجرؔ تخلص۔ وطن قدیم ہاپوڑ ضلع میرٹھ ہے، ۱۹۲۵ء میں بلند شہر میں رونق افروز ہوئے اور مستقل طور پر سکونت فرمائی۔ عمر ۴۴ سال ہے، مذاق ستھرا اور انداز بیان سے کہنہ مشقی ترشح ہوتی ہے۔

رکھ لیا پردہ کسی کا زخمِ دامندار نے
گل کھلانے کو کیا تھا کام یہ تلوار نے

حشر میں پھر دے رہا ہے دعوتِ خود رفتگی
اک وہی افسوں جو پھونکا تھا جمالِ یار نے

میں کہاں اور کہاں عالمِ فانی کی نمود
کھینچ ہی لائی مگر کاوشِ ایجاد مجھے

قسمت یہ ہے کہ نقشِ کفِ پائے یار ہوں
قیمت یہ ہے کہ کوئی مرا قدرداں نہیں

ہے انتظارِ آمدِ فصلِ بہار کیوں — داماں نہیں رہا کہ گریباں نہیں رہا

آخر پہونچ گیا ہیں سرِ منزلِ مراد — ناکامیوں کا اپنی سہارا لئے ہوئے

رسم سے واقف ہیں دیوانے مگر خوگر نہیں — آج تک تصویرِ مجنوں پیرہن بردوش ہے

حجر جذبِ بیخودی ہے کاشفِ اسرارِ کل — نشۂ رنگیں متاعِ ساغرِ مے نوش ہے

شفق سمجھے ہوئے ہے جس کو عالم — ورق ہے میری خونیں داستاں کا

جنابِ حجر کی پامالیاں۔ معاذ اللہ — کشاں کشاں ترے کوچے میں لائے جاتے ہیں

ضبطِ غم سے ہر نفس پامالِ برقِ جوش ہے — دل کا ہر ٹکڑا زبانِ شعلۂ خاموش ہے

اُس کی طرف نگاہ کر جلوۂ منتشر نہ دیکھ — حدِ خیال سے گذر منظرِ رہگذر نہ دیکھ

ذوقِ طلب ہے منتظر دل کے حریمِ شوق میں — پردہ اٹھا کے آ بھی جا کھوئی ہوئی نظر نہ دیکھ

میری دعائے مضطرب کیفِ ہنا میں کھو بھی جا — آئینۂ قبول میں اپنا رُخِ اثر نہ دیکھ

عشق کی چارہ ساز ہیں حسن کی بیقراریاں — لذتِ زخمِ دل اٹھا صورتِ چارہ گر نہ دیکھ

حیرت کا اختیار ہے دنیا میں ہر کہیں — آئینہ بن گیا ہے خود آئینہ گر کہیں

کچھ بھی نہیں تو وعدۂ فردا ہی کیوں سہی — ہوتی ہیں اس خیال میں عمریں بسر کہیں

فیروز

صمصام مرزا صاحب نام فیروز تخلص لوہارو کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں عجب باغ و بہار آدمی ہیں ان سے جو حرکت سرزد ہوتی ہے جو لفظ ادا ہوتا ہے اسی پر انفرادیت کی مہر لگتی ہے، بڑھاپے کی عام بیماری بلیڈ پریشر نے جسم کو نڈھال کر رکھا ہے مگر ان کی طبع جواں بلکہ شاعری کی طرح امتدادِ ایام سے فروغ پا رہی ہے، مرزا صاحب نواب سراج الدین خاں سائل مرحوم کے بھتیجے ہیں بذلہ سنجی ان کا حصہ ہے اور اسے حرکات و سکنات سے بھی تقویت ملتی ہے، روشِ عامہ اور رائے عامہ سے غالب مرحوم بھی اس قدر مجتنب کیا ہوں گے جتنے گریزاں یہ ہیں، جسم اور خد و خال گواہی دیتے ہیں کہ جوانی میں بہت وجیہ تھے، رنگ صاف، پڑھنے کا انداز بھی بالکل منفرد ہے، اپنی پرشکوہ آواز اور نستعلیق طرزِ غزل خوانی سے عجیب سماں باندھ دیتے ہیں، صمصام صاحب کی ذکاوت اور صلاحیتوں کو غیر معتدل

انفرادیت نے ٹھیس پہونچائی ہے، بلند شہر سے ہجرت کر گئے ہیں۔

ایک ہستی یہاں ہے کستوری — ہیچ ہے جس کے آگے مغفوری
قد و قامت ہے اس کا شمشادی — رنگ روغن ہے اس کا انگوری
چہرہ اک چہرہ کتابی ہے — جس کے ہر خط کو ایک مشہوری
نافہ شب ہیں اس کے موئے سیہ — کہکشاں اس کی فرق بلوری
زلف و رخسار عکس لیل و نہار — جیسے چھلکے شفق پہ دیجوری

ہجوم یاس و غم فریاد فریاد — کہ عشق آساں نمود و مشکل افتاد
بہار زخم دل دولت زیادہ — قدوم نشتر غم خانہ آباد
حسین منزل سے ہے۔ راہ تمنّا — الٰہی ہر قدم پر ایک افتاد
جہاں ہو حسن کی فرماں روائی — دل ناداں کہاں کی داد بے داد

نگہہ دل نشیں کو دیکھ لیا — اس مکاں کے مکیں کو دیکھ لیا
آستاں پر جبیں کو دیکھ لیا — آسماں پر زمیں کو دیکھ لیا
اک نگہہ غلط ہی کیا اس نے — میرے عین الیقیں کو دیکھ لیا
چشم و لب کی جو سازشیں دیکھیں — زہر میں انگبیں کو دیکھ لیا
ہم نے آخر قضا سے ہاں کر لی — آپ کی جب نہیں کو دیکھ لیا
جس نے فیروز کی زیارت کی — اس نے شعر آفریں کو دیکھ لیا

رکھتا ہوں عشق میں دل فولاد کا بنا کر — آہوں سے کچھ تپا کر اشکوں سے کچھ بجھا کر
سوز نہاں کسی کو۔ زخم عیاں کسی کو — اے سب کو دینے والے ہم کو بھی کچھ عطا کر
فیروز وہ کہاں ہے تیری خوش اعتقادی — تو اور بتوں پہ ایمان کا فر خدا خدا کر

کیفؔ :-

قاضی متین الحق نام۔ کیفؔ تخلص۔ مُرادآباد وطن ہے۔ جوان شاعر ہیں جن کی شہرت ضلع کے علاوہ صوبہ سے تجاوز کر چکی ہے، مشاہیر شعرا میں شمار ہے۔ ایک عرصہ سے بلند شہر میں توطن اختیار کر لیا ہے، غزلیں نظمیں۔ افسانے۔ ادبی تنقیدیں اور فلمی مضامین، ان کا معجز بیان قلم کہیں بند نہیں، تغزل میں تصوّف کو سمویا ہے، وضع قطع شرعی۔ چہرہ پر ذہانت کے آثار ہیں، ترنّم سے پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔

احساس ہیں دنیا ہے نہ عقبیٰ کئی دن سے
آجا کہ ترا کیفؔ ہے تنہا کئی دن سے

نہ بخش اتنی بھی رنگینیاں زمانے کو
ترس گئے تری جانب نظر اٹھانے کو
انھیں کو چھیڑتی رہتی ہیں بجلیاں بھی کیفؔ
بچا بچا کے جو رکھتے ہیں آشیانے کو

دل کو یوں آمادہ کیجیے غم اٹھانے کیلئے
زندگی اک درس بن جائے زمانے کیلئے
عشق کیا ہے؟ ان کے دیوانوں کی سعیٔ بے پناہ
کل جہاں والوں کو اک مرکز پہ لانے کیلئے
کیا بادہ، کیسی مستی، کیا لطفِ میکشی
ہم تو پیتے ہیں انھیں ساقی بنانے کیلئے

اللہ رے عالمِ تحیّر
نظارہ بھی دام ہو رہا ہے
مرنا نہیں فرضِ عاشقی میں
جینے سے بھی کام ہو رہا ہے
اب چاہے کسی سے گفتگو ہو
ان سے ہی کلام ہو رہا ہے
ذرّے نہیں راہِ دوست میں کیفؔ
تاروں پہ خرام ہو رہا ہے

بیتابیٔ اہلِ دل بیتابیٔ جاناں ہے
موجیں بھی خراماں ہیں دریا جو خراماں ہے
ہر گام پہ سنتا ہوں آوازۂ غم میں
وہ خود جو نگہباں ہیں ہر ذرّہ نگہباں ہے
اظہارِ محبت کا کیا ذکر محبت میں
احساسِ محبت بھی اک لغزشِ پنہاں ہے

مرا ذمہ جو دنیا کے مصائب پاس بھی آئیں
ذرا دیکھے تو کوئی ان کے غم میں مبتلا ہو کر

پراگندہ تخیل، ہوش گم، دیوانگی طاری
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تم سے جدا ہو کر

حجابِ غم میں تحریکِ نشاطِ جاودانی ہے
محبت سے بہتر انقلابِ زندگانی ہے

زندگی کی ہر مصیبت میں وہ جس کے ساتھ ہوں
زندگی اس کیلئے قدرت کا اک انعام ہے

محبت میں خودداری بھی فطرت کو کیا کیجے
کہاں سے لاؤں وہ دامن جو پھیلایا نہیں جاتا
تصنع برطرف تم کیسے معبودِ محبت ہو
کہ اک دیوانہ تم سے ہوش میں لایا نہیں جاتا

اب ترا ذکر ہے اور سارے زمانے والے!
شاد باش اے مجھے دیوانہ بنانے والے!

فروغِ لالہ و گل نے ہمیں تو لوٹ لیا
بہار والے پسِ پردہ بہار ہے

ہم نے سب سے پہلے بس نظریں جنونِ عشق میں
شانِ محفل بھی نہ دیکھی جانِ محفل دیکھ کر
زندگی طوفانِ غم سے کھیلنے کا نام ہے
دل لرزتا ہے مرا دامانِ ساحل دیکھ کر

اس حال سے ہم ان کی محفل میں نہ جاتا کیف
یہ حال تو ان کو بھی دیوانہ بنا دے گا

بہت مشکل ہے یوں تو ان کی محفل تک پہنچنا بھی
مگر آنا وہاں سے اور بھی دشوار ہوتا ہے

فضائے کوچۂ جاناں میں بھی اب جی نہیں لگتا
کہاں لیجائے گا آخر مرا دیوانہ پن مجھکو
تخیل پست، فطرت تفرقہ انگیز، مقصد گم
اور اس پر دہریہ کہتے ہیں شیخ و برہمن مجھکو
ہر اک ذرہ پہ طاری کر دیا ہے کیف کا عالم
ابد تک یاد رکھے گی کسی کی انجمن مجھکو

دیکھنا یہ ہے کہ جاں کو نذرِ غم کرتا ہے کون
یوں تو ہر اک کی زباں پر عشق کا افسانہ ہے
دین و دنیا بخشنے والے ترے غم کی قسم
ان تماشوں سے بہت آگے ترا دیوانہ ہے

بغیرِ عشق کوئی کام چل نہیں سکتا
زمانہ کتنا ہی سنبھلے سنبھل نہیں سکتا

اقبال۔

اقبال الدین احمد صدیقی۔ وطن قصبہ رٹول ضلع میرٹھ، سن پیدائش ۱۹۱۸ء ہے، فارسی میں

ایم۔ اے ہیں۔ ۱۹۴۲ء سے ہر ضلع میں نائب تحصیلدار ہیں، غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں۔

کیفیتِ فراق کے دن بھی گذر گئے
سینے کے زخم بھر گئے، داغِ جگر گئے

اللہ رے دل فریبیٔ نظارۂ جمال
آنکھوں میں وہ سما گئے، دل میں اتر گئے

آخر سکون آ ہی گیا خوابِ مرگ سے
وہ شب کی زاریاں گئیں، اشکِ سحر گئے

راہِ عدم میں فرصتِ نظارہ کس کو تھی
ڈالی جہاں پہ ایک نظر، اور گذر گئے

آنکھوں میں اشک، چیں بہ جبیں، زلف پُرشکن
بگڑے وہ کیا عتاب میں گویا سنور گئے

بس اک نگاہ سے ہوئی تکمیلِ آرزو
دل اپنا ڈھونڈھتا ہوں کہ ارماں کدھر گئے

دلِ بیتاب پھر محوِ خیالِ زلفِ جاناں ہے
پریشاں پہلے ہی تھے اب تصور بھی پریشاں ہے

نہ ٹھہر اے تشنہ کامِ عشق اندھیرا ہی تو ہونے دے
یہی منزل کی تاریکی نشانِ آبِ حیواں ہے

ہوئیں جذبات میں پیدا امنگیں پھر نئے سر سے
نظر میں اپنی پھر شاید کسی کا رخ پنہاں ہے

مری آوارگی سے وسعتِ صحرا کو کیا نسبت
مسافت دو قدم کی سارے عالم کا بیاباں ہے

ہجومِ یاس میں اقبال پھر برپا ہیں ہنگامے
قیامت کی سحر ہے یا ہماری شامِ ہجراں ہے

اب بارِ عشق کا کوئی حامل نہیں رہا
وہ میں نہیں رہا وہ مرا دل نہیں رہا

ہیہات راہِ عشق میں کھویا گیا ہے دل
منزل تو ہے وہ رہروِ منزل نہیں رہا

وہ بے حجاب ہو کے ان آنکھوں میں آ گئے
اب پردۂ نگاہ بھی حائل نہیں رہا

اقبال پیشِ یار کہا ماجرائے دل
میں بیخودیٔ شوق میں غافل نہیں رہا

تری تلاش میں پھرنا ہے باعثِ تکلیف
ترے فراق میں رونا ہے درد سر کیلئے

یہ جانتے ہوئے کرتا ہوں جستجو تیری
فراق میں مجھے رونا ہے عمر بھر کیلئے

میری زباں کو عشق نے بخشی وہ لذتِ سخن
تارے بھی شب کو گرد مہ سنتے ہیں میری داستاں

منزلِ عشق کی تلاش عمرِ رواں کیساتھ ہے — راہِ عدم سے آجتک گذرے ہیں کتنے کارواں
میری نیازمندیاں لائقِ التفاتِ دوست — دوست کی مہربانیاں حاملِ منتِ گراں

نہ تھا غم دل میں جبتک کچھ حقیقت ہی نہ تھی دل کی — یہ دل اپنا کسی کے فیض سے دل ہوتا جاتا ہے
نگاہیں بار بار اٹھتی ہیں سوئے ناخدا اپنی — نظر سے دور امیدوں کا ساحل ہوتا جاتا ہے

پھر فروغِ مہر و انجم سے ہو آرائشِ (?) جمال — پہلے ویرانۂ دل کو مرے آباد تو کر

ایسا نہ ہو کہ آپ بھی ہو جائیں بیقرار — سنتے ہیں (?) آپ میرے دلِ بیقرار ہیں

دبے لفظوں میں کیوں وہ وصل کا اقرار کرتے ہیں — یقیں شاید نہیں انکو خود اپنے عہد و پیماں پر

شاد رہتے تھے بہت عشق میں تیرے عاشق — کیوں غمِ ہجر نے آکر انھیں ناشاد کیا

دل سے مرے نکل گئے جو کبھی مثلِ بوئے گل — پھر خواب کی طرح مری آنکھوں میں آگئے

قطعاتِ تاریخ طبع تذکرۃ الشعراء بلندشہر موسوم بہ تاریخی "فروغِ میکدہ" از تالیفِ لطیف عالیجناب سید محمد رضا صاحب حامد بلندشہری

(از حافظ محمد رحمت اللہ صاحب رحمت امام جامع مسجد بلندشہر) ۱۳۶۵ھ

گلستانِ خرد

تذکرہ شاعروں کا لکھا ہے — خوب ہے بوستانِ حامد ۱۳۶۵ھ
کہہ دو تاریخِ طبع رحمت — ہے بہارِ ارمغانِ حامد

دیگر

مؤلف حضرتِ حامد ہیں اس کے — نرالا (?) شاعروں کا تذکرہ ہے ۱۳۶۵ھ
یہی ہے طبع کی تاریخ رحمت — یہی کہہ دو یہ اچھا تذکرہ ہے

دیگر عیسوی

بخوبی طبع شد تالیفِ حامد — بود این تذکرہ مقبولِ عالم ۱۳۶۵ھ
مسیحی رحمت این سالِ اشاعت — فروغِ میکدہ بے مثل گفتم
۱۹۴۷

بادۂ کہن

شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بدون اختلاف شعرائے بلند شہر کے سرفہرست ہیں:-

ان کے والد نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں صاحب مظفر جنگ خاندان بنگش سے تھے، اٹھارویں صدی کے اواخر میں کوہاٹ سے دلّی آئے، ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے انھیں موضع پلول کی جاگیر عطا کی، ۱۸۱۴ء میں موصوف نے جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) کی ریاست خرید لی، نواب مصطفیٰ خاں ۱۸۰۶ء میں دلّی میں تولد ہوئے اور وہیں فارسی، عربی اور علوم مروّجہ کی تحصیل کی، غدر کے ایّام میں ٹھاکروں نے جہانگیر آباد پر حملہ کیا اور شیفتہ کو موضع خان پور میں پناہ گزیں ہونا پڑا، قلعہ اور قیمتی اثاث البیت کے علاوہ ان کا گراں بہا کتب خانہ بھی نذر آتش کر دیا گیا، ان پر بغاوت کا الزام بھی لگایا گیا اور ایک عرصہ تک میرٹھ میں محبوس رہے، لیکن بعد میں بری الذمہ قرار دئے گئے، اور ریاست واگذاشت ہو گئی، ۱۸۶۹ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔

فرزند اکبر نواب محمد علی خاں صاحب بھی علوم مشرقی کے فاضل تھے، شاعری بھی کرتے تھے، رنگی تخلص تھا، مولانا حسرت موہانی نے ان کے دیوان کو ایڈٹ کیا ہے، موصوف ایک عرصہ تک گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر رہے۔ ان کے کلام کا نمونہ آگے چل کر اسی مجموعہ میں ملیگا۔

شیفتہ کی دونوں صاحبزادیاں بھی ثروت اور مسرّت (جن کے عقد بھوپال کے شاہی خاندان میں ہوئے) صاحبِ دیوان تھیں۔

چھوٹے صاحبزادے نواب محمد اسحٰق خاں صاحب نے صوبجات متحدہ میں سشن جج کے فرائض ادا کئے۔ علاوہ بریں بہ حیثیت آنریری سکرٹری ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ انھوں نے قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں، نواب صاحب ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔

نواب اسحٰق خاں صاحب کے بڑے صاحبزادے نواب اسمٰعیل خاں صاحب ہندوستان کے

سیاسی اور علمی حلقوں میں صدر یو۔پی مسلم لیگ اور سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے متعارف ہیں، شیفتہ کی تیسری نسل میں شاعری کے سوتے خشک ہوگئے، لیکن نواب اسمٰعیل خاں صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ نے پھر جد امجد کے کمال کی طرف رجعت کی ہے، انکے دونوں بڑے بھائی پاکستان میں ہیں۔

واضح ہوگیا ہوگا کہ شیفتہ کا خاندان علم و اقتدار کے طویل اجتماع کے لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے یہ سب حسن نیک نفس رئیس اور سید اعز عالم اور بدیع الفکر شاعر کی نیت، تربیت اور فراست کی برکت ہے" ان کے تقدس اور تواضع کی داستانیں ابتک مشہور ہیں، سفر حج میں جن جن صعوبتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، ان کا ذکر شیفتہ کے فارسی سفرنامہ "ترغیب السالک الی احسن المسالک" میں ملتا ہے۔

لیکن شیفتہ کی تصانیف کے تذکرہ سے پہلے ان کے ادبی روابط کا اجمالاً ذکر کردینا ضروری ہے شیفتہ کی زندگی کے بیشتر ایّام دلّی میں گذرے، حکیم مومن خاں سے تلمذ تھا، ان کے بعد مرزا غالب سے استفادہ کرتے رہے، مومن خاں شیفتہ کے متعلق فرماتے ہیں ؎

آن شیفتہ کہ خرد گرامی باشد — سرخیل سخنوران نامی باشد
اکنوں کہ جہد نماند الّا بہ عدم — محمود ثنائی و نظامی باشد

غالب قصیدہ میں لکھتے ہیں ؎

آں ہمائے تیز پروازم کہ بال — در ہوائے مصطفیٰ خاں میزنم
عرفی و خاقانیش فرماں پذیر — سکہ در شیراز و شرواں میزنم
بنگر دبی آں کہ کلک آں را کشد — نقش گر بہ صفحۂ خاں میزنم

غالب نے شیفتہ کی سخن فہمی کا جا بجا اعتراف کیا ہے ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او — ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

غدر سے قبل دلّی میں بساط سخن پہ نواب ضیاء الدین خان نیر، مفتی صدر الدین خاں آزردہ،

حکیم احسن اللہ خاں، مولوی امام بخش صہبائی۔ مرزا غالب، سید غلام علی وحشت، تسکین، مومن تمکن تھے اردو ادب کی تاریخ نغز گویوں اور سخن سنجوں کے ایسے شاندار اجتماع کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے، دونوں زبانوں میں ایک ایک دیوان موجود ہے، فارسی کے رقعات بھی طبع ہو چکے ہیں، علاوہ بریں فارسی میں سفرنامہ حجاز لکھا جس کا اردو میں سراج منیر کے نام سے ترجمہ کیا گیا، لیکن شیفتہ کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ان کا تذکرہ "گلشن بیخار" ہے" یہ بھی فارسی زبان میں ہے "گلشن بیخار" ہماری تنقید کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس تذکرہ میں تنقید کو پہلی بار اپنی انفرادیت کا شعور اور اپنے منصب کا احساس ہوا۔

اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ادب میں شیفتہ کی اہمیت بہ حیثیت شاعر کے اتنی نہیں ہے جتنی بہ حیثیت ناقد کے ہے، اردو میں شیفتہ نے صرف غزلیں کہی ہیں، جو کسی طرح ان کی عظمت کی اساس قرار نہیں دی جا سکتیں، ان میں کہنہ مشقی کی برکتیں، ترکیب کی چستی بندش کی درستی، سلاست اور روانی یہ سب کچھ ملیگا لیکن وہ عظیم انفرادیت ڈھونڈھے سے نہ ملے گی جو کسی بالغ عصر کو ہم پیشوں سے ممتاز و سربلند کر دیتی ہے بجا کہ ان کے اشعار میں تخیل کا عمل جھلکتا ہے، اسلوب اور مضامین میں ندرت پائی جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ بہت چھوٹے پیمانہ پر ہے، اور اس کو خوشنما صناعی اور حسین موشگافی، اور دلچسپ تنوع سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

مگر ایک فن کار موشگافیوں سے بھی گل کھلا سکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ شیفتہ نے اپنے اس ہنر کے لئے کون سے خیابان منتخب کئے۔

معاملہ بندی یا تعشق کی واردات کا بیان شیفتہ کا خاص رنگ ہے اس ذیل کے اشعار میں وہ جدت، جذباتیت اور واقعیت موجود ہے جن سے ان کے تقدس اور تورع کو مطابقت دینا متعذر نظر آتا ہے البتہ حافظ کے اس شعر کا اطلاق آسان ہے۔

ع۔ چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو — رندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ

ہم اُن اشعار سے شروع کرتے ہیں جن میں یہ رنگ بہت گہرا ہے :۔

گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے — دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا
محفل طرازیوں کے مزے سب دکھاؤں گا — وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے
کیا کرتے ہیں، کیا سنتے ہیں، کیا دیکھتے ہیں ہائے — اس شوخ کے جب کھولتے ہیں بند قبا ہم

پہلے شعر سے محبوب کی ستم ظریفی کا پتہ چلتا ہے، قسمت کی ستم ظریفی یا محبوب کی ستم ظریفی۔ غالب کی طرح شیفتہ کے یہاں یہ لہر برابر ملتی ہے۔ ان کا محبوب بھی شعلہ خو اور بے سبب آزار ہے :۔

ایسے کے آگے شیفتہ کیا چل سکے جہاں — احسان ایک عمر ہے ایک رات کا
ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا — سمجھے جو گرمیٔ ہنگامہ جلانا دل کا
اس وقت ہم گنے گئے احباب خاص میں — آیا جو تذکرہ کبھی لطف عمیم کا
قلق سے نالۂ موزوں نکل آئے تو کہتے ہیں — تمھیں کیا غم گزرتی ہے تمھاری شعر خوانی میں
ہر چند مجھ سے بے سبب آزردہ ہے مگر — ڈرتا ہوں میں منانے سے آزردہ تر نہ ہو
جس لب کے غیر بوسے لیں اس لب سے شیفتہ — کمبخت گالیاں بھی نہیں میرے واسطے

شیفتہ کے اشعار میں بھرتی بہت کم ہے، رسمی مضامین وافر ہیں لیکن انھیں چست بندش ندرتِ بیان اور شوکت الفاظ سے بلند کر دیا ہے ؎

صیاد کا دِل اس سے پگھلنا متعذر — جو نالہ کہ آتش فگن دام نہ ہوگا
آزاد ہے عذابِ دو عالم سے شیفتہ — جو ہے اسیر سلسلۂ تاب دار کا
ہلاکِ جلوۂ زیبا، خرابِ بادۂ ناب — تمھارے شیفتہ معلوم ہیں شعار مجھے
عنان ضبط کوئی شیفتہ سے تھمتی ہے — کہ ہر کرشمہ ہے چالاک ہر ادا گستاخ

شیفتہ نے خود بھی حسین اور معنی خیز تراکیب اختراع کیں، مثلاً بادۂ عنبر شمیم، فسردہ طبعی، بدیع نغمہ طرۂ خوش خم۔ یہاں غالب و مومن کا اثر ظاہر ہے۔

لیکن اس حقیقت سے تنقید نے آنکھیں بند کر لی ہیں، کہ شیفتہ۔ غالب۔ اور مومن کی بہ نسبت آتش و ناسخ سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں رعایت لفظی کی ویسی ہی افراط ہے جیسی آتش کے یہاں (کمتر) اور ناسخ کے یہاں (بیشتر) ملتی ہے۔

ہزار مرتبہ فرہاد جان شیریں دے — یہی ہے حق نمک عشوہ ہائے شیریں کا،

نقش تسخیر غیر کو اس نے
خوں لیا تو مرے کبوتر کا

کھٹکوں عدو کی آنکھ میں تا بعد مرگ بھی
کانٹے مرے مزار پہ رکھنا بجائے گل

اس رشک گل نے لی ہے جو بلبل تو عندلیب
دیکھے چمن میں شور کوئی عندلیب کا

آخری تینوں اشعار کو ناسخ کے دیوان میں رکھ دیجئے، امتیاز دشوار ہوگا۔ یہ رعایت کہیں کہیں لطیف بھی ہے اور اس ذیل میں آتش کے بہترین اشعار کی یاد دلاتی ہے۔

رشک خسرو بے تصرف ناز شیریں بے اثر
سینۂ فرہاد مثل بے ستوں سل ہو گیا

خاک عرض مدعا اس سے کروں
جس کو باتوں میں کدورت ہو گئی

قدم بھی ہم کو نہ رکھنے دیا گلستاں میں
ہزار بار قدم ہم نے باغباں کے لئے

یہ رعایت جہاں تشبیہ کا دامن تھام لیتی ہے اور موثر ہو جاتی ہے، ایہام تشبیہ اور رعایت ان تمام صنائع کی طاقتیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔

اضطراب جرس ہے کیوں دل کو
کہیں جنبش ہوئی ہے محمل کو

مت چھیڑ اے رقیب کہ مانند زلف یار
سرتا بہ پا شکستہ ہوں پہ مضمحل نہیں

ایسی تشابیہ کی سادگی اور تازگی میں بھی شیفتہ آتش سے متاثر نظر آتے ہیں۔

رہتے ہیں باہم فن سے مثالِ ورق و حرف
اب ان کے رہا کرتے ہیں تحریر کے مشتاق

کیا بوالہوسوں سے دلِ عاشق کا گلہ ہو
غیروں سے بھی کرتا ہے کوئی گھر کی شکایت

وجد میں لائے اہلِ درد ہمیں
باد کے ساتھ خاک ہے رقاص

گوشہ گیری سے بھی گردش نہ گئی طالع کی
پھرتے ہیں صورتِ دولاب ترے کوچہ میں

جور و ستم عیاں ہے وفا و کرم نہاں
لڑتے ہیں جاگتے میں مناتے ہیں خواب میں

اور کہیں کہیں قلندرانہ رنگ ملتا ہے، جسے خواہ آتش سے نسبت دیجئے خواہ مومن سے :-

سجدے کی کسی در پہ تمنا نہیں رکھتے
گردن پہ سرِ ناصیہ فرسا نہیں رکھتے

تقابل اور تضاد کے اشعار بھی آتش کے رنگ میں ہیں۔

کہوں میں کیا کہ کیا دردِ نہاں ہے
تمھارے پوچھنے ہی سے عیاں ہے

اجل لینے کی ہے کس دم مہربانی
کہ جب پہلو میں وہ نامہرباں ہے

اساتذہ لکھنؤ کے ساتھ ایک اور مشترک پہلو "دوغزلوں" کی افراط ہے، مومن و غالب نے اس نوع کی پُرگوئی سے احتراز کیا ہے۔ ایک اور قدرِ مشترک وہ دشوار اور ویران کن ردیفیں ہیں جن کے شکنجہ میں شیفتہ کی کئی غزلیں جکڑی ہوئی ہیں مثلاً زنجیر کے بوسے۔ اشارات میں نہیں، فسانہ شبِ وصل، تعذیر کے مشتاق۔ شمع چراغ۔ واحفظ ربط۔ بادہ فروش۔

کسی پرانے مضمون کو نئے انداز سے بیان کر دینا، کسی مانوس شے کو نئے زاویے سے دیکھنا شاعر کیلئے دشوار نہیں۔ یہی ملکہ ندرتِ فکر یا جدّتِ مضامین کا مخزن ہے۔ شیفتہ کے یہاں چھوٹے پیمانہ پر اس کا عمل ملتا ہے۔

کیا وہ متاع جس کی نہ ہو کوئی گھات میں
ڈرتا ہوں میں جو دزدِ دلیں کا زوال نہ ہو

ناصح کسی زبان ترے بس میں جب نہ ہو
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

کون کہتا ہے کہ ظلمت میں کم آتا ہے نظر
جو نہ دیکھا تھا وہ ہم نے شبِ ہجراں دیکھا

شیفتہ رعایتِ لفظی پر بظاہر فریفتہ ہیں۔ لیکن اُن کے اشعار میں یہ اشارہ مل جاتا ہے کہ وہ اسے محض تزئین کے طور پر کہیں کہیں استعمال کر لیتے ہیں۔ اور اس کی افراط کو نظرِ تحسین سے نہیں دیکھتے۔ مندرجہ ذیل اشعار کہتے ہوئے خفیف سا تبسم شیفتہ کے ہونٹوں پر ضرور رہا ہوگا، اس اہلِ نظر کا تبسم جس میں حسِّ ظرافت (Sense of humour) ہے جو اپنی بے تحاشہ الجھا ایسی بات کذائی پر خندہ زن ہو سکتا ہے۔

میں جل گیا وہ غیر کے گھر جو چلے گئے
شعلے سے استعارہ آوازِ پا کروں

یہ (Sense of humour) اس لطیف طنز میں بھی ملیگا جو شیفتہ کے کلام کے دلکش ترین محاسن میں سے ہے۔ اسی نگارخانۂ طنز میں ان کے ستم ظریف محبوب کی تصویر نظر آتی ہے یہیں قسمت کی ستم ظریفیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور یہیں ایک تیز نگاہ تمام رنگین حجابات چاک کر کے حقیقت تک پہونچ جاتی ہے۔

واہ اے طالعِ خفتہ کہ شبِ عشق میں بھی
رہیں بے خوابیِ اغیار نے سونے نہ دیا

خیاط نے مگر عملِ سیمیا کیا
گل برگ کو جو غنچۂ سوسن بنا دیا

خندہ زن ہیں دوست مرے دیدۂ پُرآب سے
بختِ دشمن کو جگائیں مرے نالے خواب سے

ہے دشمنوں سے ان کو ملاقاتِ ایروکشت
ملتے ہیں ہم سے جیسے کہ خس سے شرر ملے

واں بار ہو گیا ہے نزاکت سے نازبھی
یاں ضعف سے دماغ و دلِ آرزو نہیں

ع واں شوق داستاں ہی یہاں داستانِ شوق

اس نوبہارِ حُسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کاہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو لو تم سے محبت نکلی

ہم سے وہ ناحق جو خفا ہو گئے
شیفتہ کچھ ایسی ہی تقصیر ہے

تو کیا ہم آپ کہتے ہیں ہم نے بُرا کیا
سب کی بُرائیاں جو سہیں تیرے واسطے

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں
خیر اُن سے تمھیں نفرت ہی سہی

اگر کہو کہ تو عاشق نہیں میں سچ جانوں
تمھاری بات کا ایسا ہے اعتبار مجھے

ناصح اور واعظ پر کئی جگہ چوٹ کی ہے مگر کہیں درشت لہجہ میں نہیں :۔

ان کی باتیں ہم نے بھی چھپ کر سنیں
آج ناصح کو نصیحت ہو گئی

ہے بڑھاپے میں خوفِ بدمستی
کہ جوانی میں کم خراب رہے

کچھ نشۂ مے سے نہیں کم نشۂ نخوت
تقویٰ میں بھی صہبا کا اُٹھاتے ہیں مزا ہم

مطلب مے و معشوق سے ناصح کو نہیں اور
ہم دیدۂ بینا دلِ دانا نہیں رکھتے

اس شعر میں بین السطور خفیف استہزا نظر آتا ہے :۔

کہیں نہ جائے بُتِ مہروش یہ ممکن ہے؟
خلل پڑے متحیّر کہ جو آفتاب نہ ہو

شیفتہ کی حقیقت رس توازن پسند نگاہ خود اُن کو نہیں بخشتی :۔

فسانے اپنی محبّت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کیلئے

اس قبیل کے اشعار میں شاعر اور عالم جذبہ اور دانش کے تصادم کی مدھم سی آواز سنائی دیتی ہے، یہ کشمکش شیفتہ کے لبظاہر پُرسکون کلام میں سے کہیں کہیں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے، مگر یہ کشمکش زیادہ شدید نہیں، اور یہ بھی شیفتہ کی شاعرانہ کم مائگی کا ایک راز ہے۔

اس کم مائگی کا مزید ثبوت شیفتہ کی ان بے شمار غزلوں میں ملے گا جو انھوں نے اساتذہ بالخصوص آتش۔ مومن اور غالب کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ان ہی زمینوں میں کہی ہیں ایسی غزلوں کی کثرت سے آزادیٔ فکر پر حرف آتا ہے۔ مذکورہ بالا شعر:۔

(بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کیلئے ...)
والی غزل غالب کی اس غزل پر کہی گئی ہے :۔

ملا ہے اوروں کو بھی تا کہیں نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

"نفرت ہی سہی" والی غزل غالب کی مشہور غزل کا عکس ہے۔ آتش کی ایک غزل کا مطلع ہے ۔

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

اس پر شیفتہ کی غزل کا اقتباس اس مجموعہ میں نظر سے گذرے گا، اسی طرح ان غزلوں کی زمینیں بھی جن کی ردیں "شمع" "چراغ" ہیں، آتش سے ماخوذ ہیں۔

حسرتی کے دیوان میں فارسی کے اساتذہ بالخصوص حافظ نظیری اور غالب کی غزلوں پر بے شمار غزلیں ملینگی۔ حافظ سے شیفتہ بہت متاثر ہیں اور حافظ کے رنگ میں انھوں نے فارسی اور اردو میں بہت اچھی غزلیں کہی ہیں۔ شیفتہ کے یہاں متصوفانہ مضامین جس وقت خمریات کی قبا پہن لیتے ہیں شعر سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ شیفتہ کی خمریات کو ابھی تک وہ اہمیت نہیں دیگئی جسکی وہ مستحق ہیں :۔

شیشہ اتار شکوہ کو بالائے طاق رکھ
کیا اعتبار زندگی بے ثبات کا

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملے گا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

تری شمیم نے گلزار کو کیا برباد
تری نگاہ نے کھوئی دوکانِ بادہ فروش

میخانہ نشیں قدم نہ رکھیں
بزمِ جم و بارگاہ سکے میں

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شیفتہ نے مومن اور غالب کے اثر کو قبول نہیں کیا، ان کے اثرات غائت اشتہار سے محتاج اعادہ نہیں۔ رشک کے مضمون کو ہی لے لیجئے :۔

کیا جانے در دِ زخم کو گو ہو شہیدِ ناز
جو سیم کشتِ خنجرِ رشکِ عدو نہیں

ہے ستم کے رشک کا ان کے گماں میں امتحاں
غیر کا کرتے ہیں میرے امتحاں میں امتحاں

جاتے ہو اگر غیر کے گھر ضد سے ہماری — ہم آپ گئے آنے کی تمنا نہیں کرتے

شیفتہ کی ظرافت اور طنز اور محبوب ستم ظریف کا رشتہ بھی غالب کی خصوصیات سے جوڑا جا سکتا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کا لطف ملتا ہے، لیکن شیفتہ نے محاورہ کو اس سلیقے کے ساتھ برتا ہے، کہ اس کی طرف توجہ صرف ضمنی طور پر جاتی ہے۔

سفیہہ جیسے کہ خدمت سے چل نکلتے ہیں

شیفتہ کے مقطعوں میں اکثر دلچسپ پہلو ملتے ہیں، وہ اپنے آپ سے چھیڑ چھاڑ روا رکھتے ہیں۔ اور اس انداز سے جیسے کہ شاعر کا کوئی بے تکلف دوست اس پر فقرے چُست کر رہا ہو۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی — ہم کیا بتائیں کل وہ ہمیں کس کے گھر ملے

اس نو بہار حسن کو بدنام مت کرو — تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

دلّی میں تو شیفتہ ہے اُستاد — ہم قصد سوئے عجم کریں گے

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں — حیران سے تمھیں نفرت ہی سہی

تشبیہ اور استعارہ کے بعد ہمارے یہاں صنائع میں حسین ترین صنعت حسن تعلیل ہے، شیفتہ کے دیوان میں اس کی چند دلفریب مثالیں ملیں گی۔

کچھ ہم قتل سے نہیں آنکھوں میں اشک سرخ — کھاتا ہے جوش خون تری تلوار دیکھ کر

نہ سجدہ ریز ہیں اعدا جو سر جھکاتے ہیں — ترا فریب سے نقش قدم مٹاتے ہیں

حسن تعلیل کے بعد حسن طلب کے دو شعر بھی سن لیجئے ؎

دِل نہ دینے کا ہم کو دعویٰ ہے — کس کو ہے لاف دلربائی کی

هزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

حسن تعلیل سے بہت قریب مگر اس سے جُدا شاعرانہ استدلال ہوتا ہے:-

معنی کی فکر چاہئیے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہو سراب میں

شیفتہ ان شاعرانِ خود آگاہ میں ہیں جو خود اپنے کلام میں شاعری کے متعلق اپنے زاویۂ نگاہ کو واضح کر جاتے ہیں۔

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ
ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال

لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم
ہاں ذکرِ خد و خال اگر ہے تو خال خال

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نا مقبول
اگر اسلوبِ عبارت میں متانت کم ہو

اس میں شک نہیں کہ سوائے چند اشعار کے جہاں معاملہ بندی کا رنگ زیادہ شوخ ہو گیا ہے شیفتہ کا طرزِ بیان عموماً متین ہے، ان کی زبان صاف ہے اور معیار سے گرے ہوئے الفاظ بہت تلاش کے بعد ملیں گے۔ مثلاً ایک جگہ "لوٗل گیا" بمعنی "جواب دے گیا" استعمال کیا ہے "بے ڈھب" اور "بے التعلق پن" کا بار غزل کی سلیس اور نرم و نازک زبان برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ مثالیں اتنی کم ہیں کہ معدوم کے برابر ہیں۔

فارسی محاورہ اور غیر مانوس فارسی قوافی سے بھی چند اشعار داغدار ہیں مثلاً

گوشہ الٹ دے یار کے منھ پر سے پردہ کا

"اخترِ تحت نشر ند" "عجب رہا" بمعنی "حیرت رہی" استعمال کیا ہے، اس شعر میں معتبر کا استعمال محلِ نظر ہے۔

روداد میں ہیں شیفتہ کے مختلف احوال
پوچھیں گے وہاں سے جو کوئی معتبر آیا

"ہمدمِ فغاں" بمعنی "فغاں کناں"

ایک جگہ اور کہتے ہیں:۔

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

ہمیں باوجود تلاش کے میر کے اثرات زیادہ نہیں ملے۔ ایک دیوان میں اگر چند شعر اس رنگ

کے نکل آئے تو کیا ہوا۔

تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا دیا

اتنی بھی بُری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکا دیا
ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

یہ اشعار شیفتہ کے محاسن کلام کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا انداز صاف ہے، الفاظ کا انتخاب عموماً بے عیب، اور مضامین ہلکے پھلکے اور شگفتہ۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے محاسن کی فہرست ختم ہو جاتی ہے، اگر یہ کہہ دیا جائے کہ چھوٹی بحور کی غزلوں میں بڑی روانی ہے۔ ع جن کو زہرہ بھی سُن کے گانے لگے۔

الغرض شیفتہ ہمارے یہاں دوسری صف کے شعرا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی شہرت کا باعث کچھ تو ان کی قوت نقد تھی جو گلشن بے خار میں پھل پھول لائی، کچھ ایک طرف غالب اور مومن جیسے اساتذہ سے ان کے روابط اور دوسری طرف حالی جیسے اہم شاعر اور نثر نگار کی ان سے وابستگی، اور کچھ ان کی تاریخی اہمیت، ان کے کلام میں لکھنؤ اور دلی کے رنگوں کا امتزاج ملتا ہے لکھنؤ کی معاملہ بندی کو دلی کی تہذیب کی چھلنی میں چھان کر لطیف کر لیا گیا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا کی طرح زبان بالعموم صاف ہے، دلی اسکول کی تخیل اور مضمون آفرینی لکھنؤ کی سادہ زبان کی شفاف تہ میں صاف جھلکتی ہے۔

شیفتہ کے اردو کلام پر تنقید کرنے کے بعد اُن کی فارسی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا تکرار کا رنگ پیدا کریگا جس سے گریز اَولیٰ، دونوں زبانوں میں ان کے کلام کی خصوصیات کم و بیش مشترک ہیں۔ اساتذہ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزلیں کہی گئی ہیں۔ یہ گویا صائب کی روش کا تتبع ہے۔ بعض غزلوں میں مقطع میں

صراحت کر دی ہے ۔

حسرتی نیز ہماں گفت کہ حافظ گفتی — مدعی گر نکند فہم سخن گو سر و خشت

دیوان حسرتی کا آغاز دیوان حافظ کی پہلی غزل کی زمین میں ہوتا ہے، یہ تتبع صرف زمینوں میں نہیں ہے، حسرتی پر حافظ کا رنگ بہت گہرا ہے ۔ مزاجوں کی مؤانست اس اشتراک کا مخزن ہے ۔ شیفتہ کی شخصیت میں بھی تصوف مے پرستی اور تورع کا وہ امتزاج ملتا ہے جو حافظ کا سرمایۂ امتیاز اور ان کی شاعری کا سرچشمہ ہے، ان کے دیوان میں لسان الغیب کی آواز سنائی دیتی ہے، وہی ندرت وہی جوش وہی شکوہ ۔

جزای آنکہ شب ہجر خون دل خوردم — بیا بہ ساغر مہتاب آفتاب انداز

ہر چند ز خود بی خبرانند ولیکن — با اہل خرابات ز ہر جا خبری ہست

مرید پیر مغانم کہ بادشاہ و گدا — مراد خویش ازیں آستانہ می خواہند.

"مرید پیر مغانم" "خوش آں زماں کہ" کی قسم کے فقرے بھی خواجہ حافظ کی بازگشت ہیں ۔ معاملہ بندی میں وہی متاخرین کا انداز ہے، البتہ حسرتی کی غزلوں میں بہ نسبت شیفتہ کی غزلوں کے معاملہ بندی کا رنگ نسبتاً ہلکا اور خمریات کے نقوش نسبتاً گہرے ہیں :۔

با حسرتیِ شیفتہ اربابِ خرابات — گفتند کہ عشق است بہ دیوانِ تو مارا

علاوہ بریں معاملہ بندی میں متاخرین کی سی دقیقہ سنجیاں بھی نہیں، لیکن اس ذیل کے اشعار بلا کے مزہ دار ہیں:

مکن از شراب منعم کہ نہ از ہجوم مستی است — کہ گرفتہ ام ز شوخی لبِ نازکت بہ دنداں

تا کجا بہ سرِ خویش و بہ رُخِ غیر زدن — دست در دامنِ آں شوخِ ستم گار زنم

بہ جبینم ز شب وصل کجا چہ بوالعجبی است — بہ چشم ماست قصیر و بہ چشم دوست طویل

تو مپندار کہ ایں کم نگہی عشوہ گری است — حسرتی سادہ رخاں شرم و حیا نیز کنند

مگر آں دلنواز می آید — ذوقِ دیگر بہ نالۂ جرس است

رشک کے مضمون میں نئی نئی باتیں پیدا کی ہیں۔

اگرچہ غیر زمن ہرچہ گفت گفت دروغ　　دلی خوشم کہ ترا رشک در دل افتادہ است
از رشکِ غیر میرم و بر لب نیاورم　　ترسم امیدوار بہ تو بیشتر شود

دیوان کا ہر صفحہ ایک دستاویز ہے اس بات کے ثبوت میں کہ حسرتی کو فارسی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اتنی ہی قدرت جتنی اردو پر، فارسی کو وہ اہل زبان کے اعتماد اور بے تکلفی کیساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہ محسوس نہیں ہوتا، (کیونکہ ایسا ہی نہیں) کہ فکر اردو میں کیگئی ہے اور فارسی میں نظم کر دیا گیا ہے۔ کسی تنگ نظر ایرانی نقاد کو بھی ان کی زبان کے خلاف زیادہ مواد نہ مل سکے گا۔

غالب سے اعتقاد کا دامن یہاں بھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

ای حسرتی مپرس ز غالب کہ از غزل　　آں کار می کند کہ بہ افسوں نہ کردہ کس
ای حسرتی شنیدم در بزم نکتہ سنجاں　　خوشتر ز طرز غالب طرز دگر نباشد
آنچہ فلک نخواست است ہیچ کس از فلک نخواست　　ظرف فقیہہ می نخست بادۂ ما گرک نخواست

غالب کی اس غزل کو سامنے رکھ کر شیفتہ نے وہ غزل کہی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"آنچہ خدا نخواستہ خاطر ہیچ یک نخواست"

دیوانِ حسرتی کے آخر میں چند قصائد ہیں۔ یا نعت یا منقبت میں، خاقانی، انوری، اور عرفی کے مشہور قصائد سے زمینیں مستعار لی ہیں مثلاً۔

گر سرِ آشتی و مدارا بر آورم　　پرخاش از سکندر و دارا بر آورم
رستم از ہجر و بہ منزل گہ جاناں رفتم　　جانبِ محمل لیلی از دشت مغیلاں رفتم

لیکن ان اساتذہ سے کوئی مقابلہ نہیں، قصیدہ کے میدان میں قدم رکھتے ہی حسرتی کا اشہبِ فکر شست گام ہو جاتا ہے۔

یہ امر بظاہر تعجب انگیز ہے کہ شیفتہ اور حسرتی کے کلام میں غدر کے پرآشوب ایام کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اس سے شدت کے ساتھ متاثر نہ ہوئے ہوں۔ ایسا ذکی الحس انسان جو تاریخ پر گہری نظر رکھتا ہو اور جو ایک عرصہ حکومت مغلیہ سے وابستہ رہ چکا ہو کیونکہ اس بساط کے اٹھنے پر مطمئن رہ سکتا ہے اگر بفرض محال شیفتہ نے قومی حکومت اور آزادی کے چھن جانے کو اہمیت نہ دی تھی تو کیا انھوں نے ایسے عالم فرار اور ایام جس کے شدائد سے بھی اثر نہ لیا ہوگا، شاید انھوں نے غم روزگار پر فریاد و زاری کو خلاف وضع سمجھا، شاید اس کے اظہار میں مصلحت دیکھی نہ کبھی ممکن ہے کہ ڈھونڈھے سے ان کی غزلوں میں ہی ایک آدھ سیاسی مفہوم کی نکل آئے۔ غزل کی تنگنائے میں بیک وقت اخفا و اظہار کی بڑی گنجائش ہے۔

بہ جز شناختن فہم ناقص و کامل
دگر چہ سود بود حسرتی ز شعر دقیق

کیا یہ افسردگی اس وقت ہمہ گیر نہ تھی؟:—

جو حال پوچھنا ہو تم اس سے ہی پوچھ لو
مجھ کو دماغ قصۂ غم ہائے دل نہیں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ان اشعار میں شاید محض تغزل نہیں ہے۔

مت چھیڑ اے رقیب کہ مانندِ زلفِ یار
سرتا بہ پا شکستہ ہوں پر مضمحل نہیں

اس شعر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز و عروج کی داستان پڑھی جا سکتی ہے۔

نہ سجدہ ریز ہیں اعدا جو سر جھکاتے ہیں
ترا فریب سے نقشِ قدم مٹاتے ہیں

ہزار جلوۂ رنگیں ہیں اور ہر جلوہ
سواد سحر لیے چشم خوں فشاں کے لیے

غزلیات شیفتہ

میری فنا ہے مشعلۂ محفلِ لقا
پروانہ ہوں میں پرتو شمع قدیم کا

پیمانِ ترکِ جاہ لیا پیرِ دیر نے
پیمانہ دے کے بادۂ عنبر شمیم کا

اس شوخ کج ادا سے نہ آئی موافقت — کیونکر گلہ نہ ہو مجھے طبعِ سلیم کا
اس وقت ہم گنے گئے احبابِ خاص میں — آیا جو تذکرہ کبھی لطفِ عمیم کا

جب سے عطا ہوا ہمیں خلوتِ حیات کا — کچھ اور رنگ ڈھنگ ہوا کائنات کا
شیشہ اتار شکوے کو بالائے طاق رکھ — کیا اعتبار زندگیِ بے ثبات کا
ایسے کے آگے شیفتہ کیا چل سکے جہاں — احسان ایک عمر ہے، ایک رات کا

کیا فائدہ نصیحتِ ناسود مند کا — کیا خوب پند گو بھی ہے محتاج پند کا

یکتا کسی کو ہم نے نہ دیکھا جہان میں — طولِ امل کا خواب ہے زلفِ دراز کا

شمیمِ زلف یہی ہے تو وحشتِ دل نے — کب انتظار کیا موسمِ ریاحیں کا
عجیب حال میں ہے شیفتہ معاف کرو — جو کچھ تصور بھی ہو اس غلامِ دیریں کا

ہائے اس برقِ جہاں سوز پہ آنا دل کا — سمجھے جو گرمیِ ہنگامہ جلانا دل کا
ہے ترا سلسلۂ زلف بھی کتنا دلبند — پھنسنے سے پہلے بھی مشکل تھا چھڑانا دل کا
ہم سے پوچھیں کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر — کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا

شعلہ رو یار، شعلہ رنگ شراب — کام یاں کیا ہے دامنِ تر کا

آزاد ہے عذاب دو عالم سے شیفتہ — جو ہے اسیر سلسلۂ تابدار کا

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا

اس سے میں شکوہ کی جا شکرِ ستم کر آیا — کیا کروں تھا جو مرے دل میں سو زباں پر آیا
نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین — دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

کون کہتا ہے کہ ظلمت میں کم آتا ہے نظر — جو نہ دیکھا تھا سو ہم نے شبِ ہجراں دیکھا
ہمیں تھا آپ قصدِ عرضِ احوال — جو وہ خود پوچھتے ہیں پوچھنا کیا

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
(قطعہ) تلوّن سے ہے تم کو مدعا کیا

کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں
کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا

کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں
کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا

کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں
کبھی الطافِ حسرت آزما کیا

کبھی وہ طعنہ ہائے جانگزا کیوں
کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا

کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی
کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا

یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف
جواب اک مختصر مجھکو دیا کیا؟

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

رشکِ خسرو بے تصرف نازِ شیریں بے اثر
سینۂ فرہاد مثلِ بے ستوں سل ہو گیا

عرضِ تمنا سے رہا بے قرار
شب وہ مجھے میں اسے چھیڑا کیا

ان کو محبت ہی میں شک پڑ گیا
ڈر سے جو شکوہ نہ عدو کا کیا

دیکھئے اب کون ملے خاک میں
یار نے گردوں سے کچھ ایما کیا

چشمِ عنایت سے بچی جاں مجھے
نرگسِ بیمار نے اچھا کیا

اس خلشِ ابرو کا گلہ ہو نہیں سکتا
دل گوشت ہے ناخن سے جدا ہو نہیں سکتا

واہ اے طالعِ خفتہ کہ شبِ عیش میں بھی
وہم بے خوابیِ اغیار نے سونے نہ دیا

وا رہیں صورتِ آغوش سحر تک آنکھیں
شوقِ ہمخوابیِ دلدار نے سونے نہ دیا

تابِ بوسہ کی کسے شیفتہ وہ دیں بھی اگر
کر چکے کام یہاں لذتِ دشنام اپنا

جی داغِ غمِ رشک سے جل جائے تو اچھا
ارمان عدو کا بھی نکل جائے تو اچھا

پروانہ بنا کس سے جلانے کو وفادار
محفل میں کوئی شمع بدل جائے تو اچھا

وہاں تیرہ روزوں کی پروا کسے جہاں شوق ہو سیرِ مہتاب کا
پڑے صبر آرام کی جان پر مری جان بے صبر و بے تاب کا

صیاد کا دِل اس سے پگھلنا متعذر جو نالہ کہ آتش فگن دام نہ ہوگا
جس سے ہے مجھے ربط وہ ہے کون کہاں ہے الزام کے دینے سے گو الزام نہ ہوگا

مشاطہ نے مگر عملِ سیمیا کیا گل برگ کو جو غنچۂ سوسن بنا دیا
دامن تک اس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار شب موم کر لیا سحر آہن بنا دیا
صحرا بنا رہا ہے وہ افسوس شہر کو صحرا کو جس کے جلوہ نے گلشن بنا دیا
اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

شرماتے اس قدر رہے کیوں آپ رات کو مدت میں گو ملے تھے مگر میں نیا نہ تھا
ساقی کے بے مدد نہ بنی بات رات کو مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

وہ آہ تار و پود ہو جس کا ہوائے زلف کرتی ہے عنبری و صبائی تمام شب
افسانے سے جگا رہی ان بن ہی خواب سے بے فکرِ وصل و ذکرِ جدائی تمام شب

کیا ہوا بوالہوسوں سے دِل عاشق کا گلہ ہے غیروں سے بھی کرتا ہے کوئی گھر کی شکایت
اب ظلم سرشتوں کی نگہ سے ہوں مقابل ہوتی تھی کبھی کاوشِ نشتر کی شکایت

کفایت تھی مجھ کو تو چینِ جبیں کیا قتل کا اور ساماں عبث
طلبگارِ راحت ہیں نادر مند اگر درد ہے فکرِ درماں عبث
شکایت کو اس نے سنا بھی نہیں کھلا غنچہ پر رازِ پنہاں عبث

فانوس میں نہ شمع نہ شیشہ میں ہے پری ساغر میں جس بہار سے ہے جلوہ گر ہے آج

پروانوں کا داغ بھی ہے آسمان پر
نورِ چراغ میں جو فروغِ تبسم ہے آج

ہر سمت جلوہ گر ہیں جوانانِ لالہ رو
گلزار جس کو کہتے ہیں وہ اپنا گھر ہے آج

سفینہ جیسے کہ خدمت سے چل نکلتے ہیں
غرورِ مہر و وفا نے کیا مجھے گستاخ

عنانِ ضبط کوئی شیفتہ سے تھمتی ہے
کہ ہر کرشمہ ہے چالاک ہر ادا گستاخ

ہر بُنِ مو سے دھواں اُٹھتا ہے
آتشِ غم کو چھپاؤں کیونکر

یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ
اس کی ہیں یاد بھلاؤں کیونکر

کچھ بیمِ قتل سے نہیں آنکھوں میں اشکِ سرخ
کھاتا ہے جوش خون تری تلوار دیکھ کر

جاتے ہیں اور منع کی طاقت نہیں مگر
رہ جائیں آپ وہ مجھے ناچار دیکھ کر

آشفتہ زلف، چاک قبا، نیم باز چشم
ہیں صحبتِ شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز

میخانہ میں تمام جوانی بسر ہوئی
لیکن ملا نہ منصبِ پیرِ مغاں ہنوز

اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

ہند کی وہ زمین ہے عشرت خیز
کہ نہ زاہد جہاں کریں پرہیز

رند کیا یاں تو شاہد و مے سے
پارسا کو نہیں گزیر و گریز

ہے غریبوں کو جرأتِ فریاد
ہے فقیروں کو عشرتِ پرویز

عیش نے یاں بٹھا دیا ناقہ
غم نے کی یاں سے رخش کو مہمیز

اٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستانِ بادہ فروش
طلسمِ ہوش رُبا ہے دکانِ بادہ فروش

مے و سرود کے اسرار آپ آ کر دیکھ
نہ پوچھ مجھ سے کہ ہوں رازدانِ بادہ فروش

تری شمیم نے گلزار کو کیا برباد
تری نگاہ نے کھوئی دکانِ بادہ فروش

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملیگا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

ان کو دشمن سے ہے محبت خاص — یہ ہمارا ہے ثمرۂ اخلاص
وجد میں لائے اہل درد ہمیں — باد کے ساتھ خاک ہے رقاص
دل کے ٹکڑے اڑا، نہیں ہے گناہ — نفس کو قتل کر، نہیں ہے قصاص

* * *

دو دن میں تنگ ہو گئے جو پہر سے — اس حوصلہ پہ کرتے تھے اسکی جفا کی ربط

* * *

کسی صنم نے مگر آپ کو جلایا ہے — نہیں تو حوروں کی کیوں اسقدر ثنا واعظ
ملا کے دیکھیں کہ ہے خوب کون دونوں میں — ہم اس کو لاتے ہیں تو حور کو بلا واعظ

* * *

پروانے کیا خجل ہوئے دیکھا جو صبح کو — تھا شب کو اسکی بزم میں خورشید جائے شمع

* * *

رہتے تھے ہم جس سے مثال ورق و حرف — اب ان کی رہا کرتے ہیں تحریر کے مشتاق
سیماب تھا دل جل کے سو اب خاک ہوا ہے — لے جائیں مری خاک کو اکسیر کے مشتاق

* * *

گو ہم سے خفا وہ ہیں گو ان سے خفا ہم — مدت سے اسی طرح نبھی جاتی ہے باہم
کچھ نشۂ مے سے نہیں کم نشۂ نخوت — تقوی میں بھی صہبا کا اٹھاتے ہیں مزا ہم
کیا کرتے ہیں کیا سنتے ہیں کیا دیکھتے ہیں ہائے — اس شوخ کے جب کھولتے ہیں بند قبا ہم

* * *

آمد آمد میں اس قدر شورش — دیکھئے کیا کریں بہار میں ہم
وہ تو سو بار اختیار میں آئے — پر نہیں اپنے اختیار میں ہم
نعش پر تو خدا کے واسطے آ — مر گئے تیرے انتظار میں ہم

* * *

درماں مریض غم کا ترے کچھ نہ ہو سکا — چھوڑے ہے چارہ گر کو دوا اور دوا کو ہم
ہیں جاں بلب کسی کے اشارے کی دیر ہے — دیکھے ہی اس نگہ کو قضا، اور قضا کو ہم

* * *

جن جن کے تو مزار سے گزرا وہ جی اٹھے — باقی رہے ہیں ایک ترے فانیوں میں ہم
آنکھوں سے لیں اشارۂ دشمن نہ سمجھتے — ہوتے نہ اس قدر جو نگہبانیوں میں ہم

پیر مغاں کے فیضِ توجہ سے شیفتہ
اکثر شراب پیتے ہیں روحانیوں میں ہم

ہوش کا پاؤں جو یاں آکے پھسل جاتا ہے
کیا لنڈھائی ہے مے ناب ترے کوچہ میں

گوشہ گیری سے بھی گردش نہ گئی طالع کی
پھرتے ہیں صورتِ دولاب ترے کوچہ میں

وہ بھی محرومِ نہیں جنکو نہیں بزم میں بار
تیرے رخسار کی ہے تاب ترے کوچہ میں

چل دیا شیفتہ سودے میں خدا جانے کہاں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں احباب ترے کوچہ میں

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

کچھ زہر اُگل رہی ہے بلبل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

ہے مستی نیم خام کا ڈر
اصرار ہے جام لے پہ پے میں

میخانہ نشیں قدم نہ رکھیں
بزمِ جم و بارگاہِ کے میں

مطرب بدیع نغمہ و ساقی پری جمال
کیا شرح حالتِ دلِ درد آشنا کروں

یا اپنے جوشِ عشوہ پیہم کو تھامئے
یا کہیئے میں بھی نالہ شورش فزا کروں

میں جل گیا وہ غیر کے گھر جو چلے گئے
شعلہ سے استعارۂ آوازِ پا کروں

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

آز و ہوس سے خلق ہوا ہے یہ نامراد
دل پر نگاہ کیا ہے وہ مجھ پر نظر کریں

کچھ اب کی ہم سے بولے تو یہ جی میں ہے کہ پھر
ناصح کو بھی رقیب سے آزردہ تر کریں

گلگشتِ باغ کس چمن آرا نے کی کہ آج
موجِ بہار مدعی رنگ و بو نہیں

واں بار ہو گیا ہے نزاکت سے ناز بھی
یاں ضعف سے دماغ و دلِ آرزو نہیں

کیا جانے دردِ زخم کو گو ہو شہیدِ ناز
جو نیم کشتِ خنجرِ رشکِ عدو نہیں

ابرِ سرشک و گلشنِ داغ و نسیم آہ
سامانِ عیش سب ہے پر افسوس تو نہیں

کچھ اور بے دلی کے سوا آرزو نہیں
اے دل یقین جان کہ ہم ہیں تو تو نہیں

بے طاقتی نے کام سے یہ کھو دیا کہ بس
دل گم ہوا ہے اور سرِ جستجو نہیں

دل ترا تنگ ہی پر آپ کہاں ہی سمائیں
دل ہمارا ہے کہ شیشہ میں شرر رکھتے ہیں

رند فارغ بھی ہوئے جامِ سحرگاہی سے
اور زاہد ابھی آہنگِ طہارت میں نہیں

جام مے دے کہ وہاں کام پڑا ہے مجھکو
کہ صبا کو بھی جہاں دخل سفارت میں نہیں

نہ سجدہ ریز ہیں اعدا جو سر جھکاتے ہیں
ترا فریب سے نقشِ قدم مٹاتے ہیں

شیفتہ سن کے وہ دیتی ہیں جو لاکھوں دشنام
اثرِ بادہ ہے گویا مرے افسانے میں

ہے ستم کے رشک کا ان کے گماں ہیں امتحاں
غیر کا کرتے ہیں میرے امتحاں میں امتحاں

تنگ تھی جا خاطرِ ناشاد میں
آپ کو بھولے ہم اُن کی یاد میں

کیونکر اُٹھتا ہے خدا، رنجِ قفس
مر گئے ہم تو کفِ صیّاد میں

غمزۂ شیریں ہی کی دولت سے تھا
جو اثر تھا تیشۂ فرہاد میں

روشن ہے مری سیاہ بختی
منّت کشِ سایۂ ہما ہوں

اس غیرتِ گل سے ربط معلوم
ہرچند میں ہمدمِ صبا ہوں

ہمدم نہ سہی محبّت اس کو
اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں

مت چھیڑ اے رقیب کہ مانندِ زلفِ یار
سرتابہ پا شکستہ ہوں پر مضمحل نہیں

لگ جاؤ آپ تو آ کے گلے سب چلے گئے
اک شیفتہ رہا ہے سو وہ کچھ مخل نہیں

قلق سے نالۂ موزوں نکل آئے تو کہتے ہیں
تمھیں کیا غم گذرتی ہے تمھاری شعرخوانی میں

کلفتِ دل سے ہے جو آلودہ
گوہرِ اشک آبدار نہیں

شکوہ آئینِ محبّت میں ہے ایجادِ لطیف
نسخۂ اصل میں ہرچند کہ یہ باب نہیں

مصرع :- واں شوق داستاں ہے یہاں داستانِ شوق

ہم آج تک چھپاتے ہیں یاروں سے رازِ عشق
حالانکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں

معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو
دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں

پھر ہے ہوائے مطربی ہے ہم کو شیفتہ
مدت گزر گئی ورع و اجتناب میں

ہوتا ہے اژدہام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشادِ نقاب میں

جور و ستم عیاں ہے وفا و کرم نہاں
لڑتے ہیں جاگتے میں مناتے ہیں خواب میں

اس نو بہارِ حسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

عید ہے اور ہم کو عید نہیں
اگر آ جائیے بعید نہیں

شیفتہ اور بھی ملیں نغمہ سرا
پر یہ آہنگ یہ نشید نہیں

ہے گونہ گونہ شک ابھی عفو گناہ میں
جو ہے زبان پر وہ نہیں ہے نگاہ میں

ہر خار و خس ہے وجد میں ہر سنگ و خشت مست
کیا میکشوں نے آ کے کہا خانقاہ میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ہم سے جو ہو غبار تو دشمن سے صاف ہو
تقصیر ہو کسی سے کسی کی معاف ہو

گر عفو ہو قصور تو اک عرض ہے ہمیں
یہ عرض ہے قصور ہمارا معاف ہو

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

کہیں نہ جائے بتِ مہر وش یہ ممکن ہے
خلل پڑے متحرک جو آفتاب نہ ہو

توسنِ ناز اٹھاتے کیوں ہو
خاک میں شہر ملاتے کیوں ہو

حاصل اس سلسلہ جنبانی سے
فتنۂ خوابیدہ جگاتے کیوں ہو

آتشِ عشق کہیں بجھتی ہے — شیفتہ اشک بہاتے کیوں ہو

کس نے تاراج کیا ملکِ دل و دیں کہیے — آج تم شیفتہ کچھ بے سر و ساماں سے ہو

اضطرابِ جرس ہے کیوں دل کو — کہیں جنبش ہوئی ہے محمل کو
ہائے وہ شیفتہ کی بیتابی — تھام لینا وہ تیری محمل کو

دیکھ کر چشمِ غضب کو اسکی میں نے رو دیا — چاہیئے پانی ملا لینا شرابِ تیز کو
خطِ آزادی تھا نامہ غیر کا، اے جوشِ رشک — پھاڑ ڈالا آپ ہم نے کیسی دستاویز کو

کیا وہ متاع جس کی نہ ہو کوئی گھات میں — ڈرتا ہوں میں کہ دزدِ پسِ کارواں نہ ہو
لازم ہے یار بھی تو ہو بیتاب ورنہ کیا — وہ عشق ہے کہ رنج یہاں ہو وہاں نہ ہو

یا غیر سے بھی خوش تھے کہ تیرا تو دوست ہے — یا اب خفا ہوں اس سے جو تیرا عدو نہ ہو
کچھ پیچ و تابِ دل کا جبیں پر اثر نہ ہو — اتنا تو حوصلہ ہو، اگر بیشتر نہ ہو
کیا تاب ہے کہ تا بنِ مژگاں ہو جلوہ گر — جس قطرۂ سرشک میں لختِ جگر نہ ہو
ہر چند مجھ سے بے سبب آزردہ ہے مگر — ڈرتا ہوں میں منانے سے آزردہ تر نہ ہو
میخانے میں رہو کہ دیکھو گے عمر بھر — وہ شام جس میں پرتوِ فیضِ سحر نہ ہو
آئینِ ناز کینہ و رسمِ ادا ستم — معشوقہ بے ہنر ہے جو بیداد گر نہ ہو
اڑتی سی شیفتہ کی خبر کچھ سنی ہے آج — لیکن خدا کرے یہ خبر معتبر نہ ہو

ہم نے دیکھا ہے وہ صیقل کدہ اللہ اللہ — کہ جہاں آئینۂ دل سے کدورت کم ہو

دو چار فرشتوں پہ بلا آئے گی ناحق — اے غیرتِ ناہید نہ ہو نغمہ سرا دیکھ
اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت — دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

کہوں میں کیا کہ کیا دردِ نہاں ہے — تمھارے پوچھنے ہی سے عیاں ہے

اجل لے کی ہے کس دم مہربانی — کہ جب پہلو میں وہ نامہرباں ہے

میرے رونے میں تو نہیں تاثیر — غیر بھی اشک کیوں بہانے لگے
ہنس کے کہنے لگے کہ ہاں سچ ہے — تم مرے ناز کیوں اٹھانے لگے
وہ غزل ہم نے شیفتہ لکھی — جس کو زہرہ بھی سن کے گانے لگے

پھر محرک ستم شعاری ہے — پھر انھیں جستجو ہماری ہے
پھر وہی داغ و دل سے صحبت گرم — پھر وہی چشم و شعلہ باری ہے
پھر خیال نگاہ کافر ہے — پھر تمنائے زخم کاری ہے
اکثر ایسے وقت کم آتے ہیں ارباب خلل — میکشی کا شغل وقتِ ابرِ باراں چاہیے

کیونکر مجھے خط رقم کریں گے — کیا غیر کا سر قلم کریں گے
ہم پیشہ ہے اضطراب و شوخی — کس واسطے مجھ سے رم کریں گے
جوشِ وحشت میں اے پری رو — بس تیرا ہی نام دم کریں گے
دلی میں تو شیفتہ ہے استاد — ہم قصد سوئے عجم کریں گے

جو کہ ہوا محوِ تجلیٔ ذات — خاک در اس شخص کی اکسیر ہے
کھیل ہے کچھ یہ کہ دکھادوں تمھیں — فرض کیا آہ میں تاثیر ہے
ہم سے وہ ناحق جو خفا ہو گئے — شیفتہ کچھ ایسی ہی تقصیر ہے

یہی ہے شکر کہ دل کی نظر تو روشن ہے — نظر تو خیرہ ہوئی برق لن ترانی سے
بھڑک گئی ہم شبنم سے اور آتش گل — یہ کیسی آگ ہے دونی ہوئی جو پانی سے

اللہ رے کافر کی نزاکت کہ اڑا رنگ — ہم نے جو لئے رات کو تصویر کے بوسے
منھ فق مری جانب وہ چلے آتے ہیں گویا — نالے نے لئے شب رخِ تاثیر کے بوسے

انصاف کر کہ چرخ کو کیا مجھ سے کام تھا — ساری اذیتیں مجھے دیں تیرے واسطے
تو کیا ہم آپ کہتے ہیں ہم نے بُرا کیا — سب کی بُرائیاں جو سہیں تیرے واسطے
جس لب کے غیر بوسے لیں اس لب سے شیفتہ — کمبخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

ہے رحم تو اس بے خود و بیتاب پہ لیلیٰ — جو اپنے ہی نالہ کو کہے بانگ جرس کی
اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیر طریقت — گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں — خیر ان سے تمھیں نفرت ہی سہی

یہ اچھا ہے تو اچھا غیر کو بھی — ستاؤ اور پوچھو کیوں غمیں ہے
یہ مجھ سے شکوہ ہے اللہ رے شوخی — کہ میرے غم سے تو اندوہگیں ہے
یہ کیسا تفرقہ ہجراں نے ڈالا — کہیں کیا ہم کہیں ہیں دل کہیں ہے
نہ پوچھو شیفتہ کا حال صاحب — یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

سجدے کی کسی در پہ تمنا نہیں رکھتے — گردن پہ سر ناصیہ فرسا نہیں رکھتے
ہر چند کہ ہے آپ سے ملنے کی تمنا — پر آپ سے ملنے کی تمنا نہیں رکھتے
مطلب مے و معشوق سے ناصح کو نہیں اور — ہم دیدۂ بینا دل دانا نہیں رکھتے

خندہ زن ہیں دوست میرے دیدۂ پُر آب سے — بختِ دشمن کو جگائیں میرے نالے خواب سے
بوئے گل کام کر چکی اپنا — دخترِ رز تہِ نقاب رہے
ہے بڑھاپے میں خوفِ بدمستی — کہ جوانی میں کم خراب رہے

ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دے گا — وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے
بدگماں آپ غلط محرمِ اسرار سے ہیں — دل نہیں راز نہانی کی خبر کرتا ہے

خاک عرضِ مدعا اس سے کروں — جس کو باتوں میں کدورت ہو گئی

ان کی باتیں اس نے بھی چھپ کر سنیں
آج ناصح کو نصیحت ہو گئی

بس نہ فرماتے پھرو یہ شیفتہ
گو انھیں تم سے محبت ہو گئی

شیفتہ اک رند مشرب شخص ہے
کس سے لوگوں کو عقیدت ہو گئی

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

جاتے ہو اگر غیر کے گھر ضد سے ہماری
ہم آپ کے آنے کی تمنا نہ کریں گے

تہ مجھ سے نہ بولیں کبھی یہ بات نہ ہوگی
وہ غیر سے باتیں کریں ایسا نہ کریں گے

شیفتہ ایسی اڑا اہل کدورت کی خاک
دیکھ کر شیشۂ ساعت کو بھی عبرت ہو جائے

کیا ذکر اس کے آ گئے مری آہ کا چلے
جس گل کی شمع بزم سے بچ کر صبا چلے

ناصح تری زباں ترے بس میں جب تک ہو
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

کیوں روکتا ہے ہمیں عذر کیا ہے ساربا
دیوانہ ایک گرد محمل لگا چلے

ہے دشمنوں سے ان کو ملاقات ابر وکشت
ملتے ہیں ہم سے جیسے کہ خس سے شرر ملے

کیا پوچھتے ہو لطف کروں تجھ پہ کس قدر
اذن غرور و ناز تمھیں جس قدر ملے

محفل طرازیوں کے مزے سب دکھاؤں گا
وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

دل لیا جس نے بے وفائی کی
رسم ہے کیا یہی دلربائی کی

دل نہ دینے کا ہم کو دعویٰ ہے
کس کو ہے لاف دلربائی کی

دل لگایا تو ناصحوں کو کیا
بات جو اپنے جی میں آئی کی

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر
دینداری و پارسائی کی

آخر کار مے پرست ہوا
شان ہے تیری کبریائی کی

کھوٹی باتیں ہیں اور پہلو دار
ہاں ترے دل میں بیم ہر کچھ ہے

رم بہت، اُنس کم ہے طینت میں
وہ بہت ہے پری لشر کچھ ہے

ایک حالت پہ نہیں رہتا کوئی
اب وفا ہو، بے وفائی ہو چکی

اب کے جس صورت سے ہو مل جائیے
غیر کہتے ہیں صفائی ہو چکی

دیکھ لیں گے ہم بھی گر اغیار کو
آپ نے جھانکا سرِ دیوار سے

یا مرسل الریاح ادھر کو بھی بھیج دے
وہ بوئے خوش کہ جیبِ نسیمِ یمن میں ہے

شیوہ تمام غنچۂ نشگفتہ کا ہنوز
بندِ قبائے شاہدِ گل پیرہن میں ہے

وہ آہوئے رمیدہ کہ ہم جس کے صید ہیں
نے وادیٔ تتار نہ دشتِ ختن میں ہے

ہوا اُنس کیوں دل کو اوّل نظر میں
کہ وہ مجھ کو زود آشنا جانتا ہے

جو بیگانہ جانے تجھے خلق کیا غم
اگر آشنا آشنا جانتا ہے

اگر کہو کہ تو عاشق نہیں میں سچ جانوں
تمھاری بات کا ایسا ہے اعتبار مجھے

عدو کو رشک ہے ایسا کہ مفت میں گویا
ملی ہے جائے نفس برق شعلہ بار مجھے

ملا عدو کو نئے دو نغمہ برق و باراں سے
صبا سے خاک ملی اور گل سے خار مجھے

لیا ہی تھا نگہِ پُرفسوں نے دل لیکن
کیا ادائے تغافل نے ہوشیار مجھے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

ہلاکِ جلوۂ زیبا، خرابِ بادۂ ناب
تمھارے شیفتہ معلوم ہیں شعار مجھے

کب آپ آئے کہ طاقت نہیں اشارے کی
کب آپ آئے کہ جنبش نہیں زباں کے لئے

قدم بھی ہم کو نہ رکھنے دیا گلستاں میں
ہزار بار قدم ہم نے باغباں کے لئے

ہزار جلوۂ رنگیں ہیں اور ہر جلوہ
مواد بھر لئے چشمِ خوں فشاں کے لئے

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

جوشِ جنون و بند کی تاثیر دیکھنا
دامن کو ٹانکتا ہوں گریباں کے چاک میں

کرتے ہیں جور و جفا ناز و ادا کہتے ہیں
یہ بھی کیا لوگ ہیں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کاہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو تم سے محبت نکلی

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

جو حال پوچھنا ہو تم اس سے ہی پوچھ لو
مجھ کو دماغ قصۂ غم ہائے دل نہیں

غزلیات فارسی

ایں لالہ کہ رست از گلِ ما
داغیست کہ بود در دلِ ما

اے کردہ دلِ تو ہاں فراموش
جز یادِ تو نیست در دلِ ما

کو کشتیِ مے کہ جمع ہستند
دریا نوشاں بہ ساحلِ ما

از اختر تیرہ دل بجاں بود
شد چشمِ سیہ مقابلِ ما

بشکند طلسمِ دہر فانی
از نقشِ خیالِ باطلِ ما

تا دُردیٔ معرفت کشیدیم
آساں گردید مشکلِ ما

پیمود جامِ کم نگہی بر خرابِ عشق
یعنی کہ کم دہند بہ مستاں شراب را

ملکِ نیم روز می دارد
رشک بر عشرتِ شبانۂ ما

روز نو کردہ است شبِ تار سیہ روزاں را
لمعۂ نور کہ در ظلمتِ درویشانست

مطربِ بزم بہ ہنجار نوا سازی است
ورنہ ہر پردۂ او پردہ براندازی ست

ہمتم بیں کہ ترا شیفتۂ خود می خواہم
صعوہ در بندِ گرفتاریٔ شہبازی ست

خواجہ را شوقِ نظر بازی و من می ترسم
کہ دریں جمع حریفے قدر اندازی ست

بر طرهٔ پر شکن چه نازی / بر خسرو دلم شکسته‌تر نیست
در خاطر صاف صبح خیزان / نوریست که کمتر از سحر نیست
ماتم و فغان که در محبت / دستور ترانهٔ دگر نیست
هنگامه فروز بزم عشق است / هر چند که آه را اثر نیست

به سوی غیر ز بس تیز راند توسن را / به دل نشست غباری که بر زمین ننشست
مگر ز سوزش رشکم خبر نداشت که گفت / به بزم دوست کسی افسرده این چنین ننشست
فگنده است سپهرم به بند صیادی / که گاه دام نگسترده در کمین ننشست

به ظرف پیر خرابات می‌توان پی برد / زبان دهوی که در اهل محفل افتاده است
دعا به کعبه پذیرند لیک حیرانم / امیدوار ز بتخانه سائل افتاده است
یار را دل ربود هم هوس است / برق اندر کمین مشت خس است
شیوهٔ چند لازم رندیست / زان یکی ارتباط با عسس است
نگهی غمزه‌ای شکرخندی / اندکی التفات از تو بس است

چه بی‌خودند شهیدان عشق کز پی زخم / نمک ز مطرب شیرین ترانه میخواهند
مرید پیر مغانم که پادشاه و گدا / مراد خویش از این آستانه میخواهند
به لهو اهل خرابات انجمن نزنند / به جام می زده دو عالم کرانه می‌خواهند
شب که در بزم تو جز غیر کسی بار نداشت / آتش از شمع گرفتند بجانم دادند
کنم یاد آهی که از سینه خیزد / دهم داد تیری که در دل نشیند
ز پیش تو فرزانه دیوانه خیزد / به بزم تو دیوانه عاقل نشیند

روز وصال ناز به معشوقه می‌کنم / آری چنین کند چو به دولت گدا رسید

تنگم گرفت هجر به پیش تو آمدم هر کس دم تعب به در آشنا رود
مفلس شدیم در طلب دولت وصال حیف است بزرگی که پی کیمیا رود

از رشک غیر میرم و بر لب نیاورم ترسم امیدوار به تو بیشتر شود
جای رحم است بران بسمل مسکین که هنوز نیم جانی به تنش باشد و قاتل برود

ز شمع روی تو آنگه هم اسم که خود از من بمن آتش نیفتد
آن بادهٔ صافی که وفا نام خوش است خوش آنکه به پیمانهٔ پیمان تو پابند

دل بستن نیست ممکن امّا دل کندن ما محال باشد

فزدن ز زلف کشخط سبزا و دل را به دیده بیش خلد سبزه که نو خیز است
لطف او مومن و کافر نگذارد محروم بهر تو او به حرم نکهت گیسو بگذشت
یاران بخواب راحت و فیض دم سحر اندک ربود غنچه و اندک صبا گرفت
بس خویش را به نرخ گران می فروختم بوی تو دوش آمد و از من مرا گرفت
در چاره او کوشش که دیوانات امروز از نکهت گل بوی ترا باز ندانست

همان فروغ که رفت از رخ مه و اختر بروی لاله و گل در دمید لیت مخسپ

مرغان چمن به شوق کو پیست آتش زده آشیانه ها را
در خانهٔ ما چرا نیائی ای داده بباد خانه ها را
جویائی طریق بی زبانی وز پی نه نهد نشانه ها را
وفای وعدهٔ او از ره مهر و وفا مشمر که طبع نازک او برنمی یابد تقاضا را
دی سوخته این سخن سخته به من گفت کز آتش دل خشک کنی دامن تر را

رباعیات

گر پیر شدم چه غم شبابم بخشد — ور مخمورم شراب نابم بخشد
گر روز سیاه شد چو شب باکی نیست — در روز سیاه آفتابم بخشد

شب شیرهٔ روح از کلامش می ریخت — صهبا از لعل لاله فامش می ریخت
میگفت و نگهش از ادای بارید — می رفت و نه رفتن از خرامش می ریخت

به پای دوست دم جلوه جاں بر افشاندم — عجب که شهرهٔ شهرم به این نثار قلیل

سامع آشفته خاطر است چه سود — گر مغنی غلط نکند آهنگ
جاں گرفتار آرزو گونا گوں — دل طلبگار عیش رنگا رنگ
کار طالع بود دگر ورنه — حسرتی ساده یار پُر نیرنگ

سر تمکین تو گردم که داری — دل از اقرار و از انکار فارغ

اگر به دست بود وصل در سفر چه ضرر — دگر ز یار بود فصل در دیار چه حظ
لطافت شب مه دیدنی است در شب وصل — گر آفتاب نباشد ز ماهتاب چه حظ

اگر عشق است بیباکانه می رقص — به شوق کعبه در بت خانه می رقص
بی بر داشتن خود وجد کردی — یکی بیهوده ای فرزانه می رقص
نه با هر لب برنگ باده می جوش — نه در هر بزم چون پیمانه می رقص

باد سر مست دوش آمد و گفت — گرد کوئی وزیده ام که مپرس

دل گرفته طلبگار عالم دگر است — ز تنگنائی جهاں آستیں فشاں برخیز
جز ای آنکه شب هجر خون دل خوردم — بیا به ساغر مهتاب آفتاب انداز

هر چند ز خود بیخبر اند و لیکن — با اهل خرابات ز هر جا خبری هست

تا ندانند نا امیدم حرفِ لطف آمیز را
زعشوه های نهان تو باعث و شادم
کونین رو نمائے جمالت نمی شود
در طینت زلیخه فسرده دید عنصری
در پیش من ز لذت آمیزه نیست کم
ساقی بده که باده به اندازه می دهی
شوق برنج تو طبع زهر چیز بر گرفت
هر دم به بزم دلکش جانان گذاشت
پنهان نکردم از تو که بسیار کیستم
در ہائے سپہر بر کشادند
دیوان تو حسرتی بیاض است
تلخ گفتی و شنیدم جواب از پئے چیست
آخر خودش به شیوهٔ ترکانه برده
آتش بجان لوادهٔ فرعون می زنی
بیرون بیا ز خانه که هرگز نه دیده ام
آں فتنه ها که از پئے فردا ذخیره بود
چه روم تبسم با شم چه کنم رجوع زاں کو
خوش آں زماں به نیرنگی جذبه دل خواه
چه خطرو شست ره بر است که به گردیدی

گرچه در دل می شناسم پیش او باور کنم
بچند روز مرا نکته داں بگردانی
با ماچه دیدهٔ که خریداری می کنی
جرم تو نیست کایں همه آزار می کنی
شیریں اداییئے که به انکار می کنی
مطرب بخواں که نغمه به هنجاری کنی
دیوانه می نمائی و هشیاری کنی
اے قاصد خیال ز ا عدائے کیستی
بارے تو هم بگو که مسیحائے کیستی
بر بستر ناز خواب تا کے
از منتخب انتخاب تا کے
می توانی که تلافی به شکر خنده کنی
آں دل که بے طلب به بر ما نهاده
از شعله که در کف موسیٰ نهاده
بلبل بجاں گلی که به بازار آمده
امروز بهر چشم تو در کار آمده
نتواں نهاد گامی به هزار جان شسته
ادم به طوف حرم رسول دست الله
راست گو بودی درج باخته یعنی

پیش ازیں خاطرت از نامِ جفا می لرزید — ایں زماں تیغ بہ قتل آختہ یعنی چہ
نفحۂ موئے تو بازارِ سمن افسردہ — لمعۂ روئے تو از ورد نضارت بردہ
اندازِ خشم شوکتِ حسنت نگاہ داشت — آتش بہ پاسبانیِ آتش برآمدہ
بوئے صد باغ بجیب و دلِ خلقی بہ بغل — خندہ از لب دلآویز خم اندر خم شان
کمن از شراب منعم کہ نہ از ہجوم مستی است — کہ گرفتہ ام ز شوخی لب نازکت بدندان
چہ خوش است با تو بزمی بہ نہفتہ ساز کردن — در خانہ بند کردن سرِ شیشہ باز کردن

مرزا تفتہ

منشی ہرگوپال تفتہ غالب کے حلقہ میں امتیاز رکھتے تھے۔ ان کے نام غالب کے خطوط ہی تفتہ کی بقائے دوام کے ضامن ہیں لیکن تفتہ صرف پرتوِ مہر سے ہی تفتہ و ضیا ریز نہیں انکا سرمایۂ کمال تو ہزار اشعار کا فارسی دیوان ہے جو دوبارہ ایام غدر میں مطبع کوہ نور لاہور سے طبع ہوا

سنِ طبعِ دوم ہمیں بس — چہ عالی نسخۂ ما طبع شد واہ

۱۲۷۳ ہجری مطابق ۱۸۵۷ء

افسوس ہے کہ باوجود سعیِ بلیغ کے ہمیں "مرزا تفتہ" کے حالات دستیاب نہ ہوسکے، ان کے خاندان کا چراغ ابھی تک روشن ہے لیکن دوسرے دیار میں۔

سکندرآباد جو مرزا تفتہ کا وطن ہے بلند شہر میں کایستھوں کی راجدھانی ہے، اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ، اس شہر میں اب تک یہ روایت سینہ بسینہ چلی آرہی ہے کہ غالب مرحوم دلی سے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے یہاں جہانگیرآباد گئے تھے تو راہ میں تفتہ کے یہاں قیام کیا تھا، اس زمانہ میں دو گھوڑوں والی بند گاڑیوں کی ڈاک چلا کرتی تھی، اور راہ میں کئی جگہ گھوڑے بدلے جاتے تھے۔

مرزا ہرگوپال کے وجود کی برکت سے سکندر آباد میں ۔ اب تک شعر و شاعری کے قدردان و معرکہ آرا موجود ہیں۔

تفتہ کا دیوان ۲۰۰ صفحات اور ۹۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ چھ حصوں میں سے پانچ غزلیات کیلئے وقف ہیں۔ چھٹے حصہ میں دو نوحے ہیں، ایک اپنے دوازدہ سالہ لڑکے ہیتمبر سنگھ اور دوسرا (غالباً) اپنے شاگرد بانکے لال رند کے انتقال پر۔ پہلے نوحہ میں سوا تین سو شعر ہیں جو تقریباً اکیس شعر کے بند میں منقسم ہیں، دوسرے نوحہ میں ڈھائی سو شعر ہیں، شکل وہی ہے، انتیس شعر کا ایک قطعہ ایک مصلحب سوم بہ رضی الدین خاں کی مدح میں ہے، آخری تینتالیس ۴۳ صفحات میں رباعیات اور قطعات۔

غزلیات میں تفتہ کا مسلک یہ ہے کہ اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، مثلاً عرفی کی ایک غزل کا مطلع سامنے رکھا اور اس پر اسی زمین میں بالعموم دو یا تین اور کبھی کبھی چار غزلیں لکھ ڈالیں۔ غزلوں کا تناسب اس طرح ہے، سو غزلوں میں اسیر کی غزلوں پر اسی غزلیں ہوں گی، عرفی کی غزلوں پر دس، ظہوری کی غزلوں پر تین، باقی سات غزلوں میں چار غزلیں ایسی ہوں گی جن میں تتبع ظاہر نہیں ہے، اور ایک ایک علی حزیں فیضی اور فغانی کی غزلوں پر ہوگی۔ یہ روش ہمیں شیفتہ کے یہاں بھی ملتی ہے، تفتہ کے یہاں سانچہ اور تنگ ہو گیا ہے، بدقسمتی سے ان کے یہاں باوجود تخلص کی تاثیر کے وہ گرمی اور حرارت بھی نہیں جو شیفتہ کے یہاں سانچے کو تھوڑی دیر کیلئے پگھلا دیتی ہے، تفتہ کے اشعار شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ بہت ہموار ہیں اور بندش اور عروض کے اعتبار سے عموماً بے عیب وہ اس قدر ہموار ہیں کہ چبھتے کہیں نہیں ہیں اور یہی ان کی کمزوری ہے، تفتہ کے کوچہ میں پہونچ کر غزل کی تنگنائے اور تنگ ہو جاتی ہے۔ ایک محتاط راہرو اور ایک سعادت مند پیرو کی طرح وہ ایک قدم بھی اس گلی سے ہٹ کر نہیں رکھتے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا، کہ تفتہ کی تمام غزلیں سپاٹ ہیں وہ اپنا مخصوص

فنی حظ رکھتی ہیں۔ علاوہ بریں ہر صفحے میں ایک آدھ شعر ایسا ضرور مل جاتا ہے جو توجہ جذب کر لیتا ہے، مضامین میں موشگافیاں اور نکتہ سنجیاں کی ہیں جن میں رعایتِ لفظی اور رعایتِ خیالی کا حصّہ وافر رہتا ہے:۔

ماندہ ستے کہ از گریباں دور
دامنِ انفعال می گیرد

کفر نگذاریم ما تا زندہ ایم
کز رگِ جان است زنّارِ کسی

تعلیل کا حسن دیکھئے:۔

نگہ از پشتِ پا در حشر سر گز بر نمی خیزد
ز بارِ معصیت ہا بسکہ پشتِ من خمیدہ اینجا

تقابل کا اکثر التزام ہے:۔

در لحدِ خواب می کنم سنِ پیسر
بر لب افسانۂ جوانی ہا

از تغافل نگاہِ او پیداست
دیدم آں دیدنِ نہانی ہا

از ازل در تو تا ابد با من
سستِ عہدی و سخت جانی ہا

مضمون آفرینی کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

بنگر ضعفِ ما چہ قدر زور داشتہ است
یعنی ملامتِ ہمہ عالم کشیدہ ایم

آہنگِ نالہ کرد دل و گفت دیدہ ام
باید بحالِ عمرِ خوش ہتّی گریستن

من گر بہ کفر گردم و اینہا بگیرد من
دارند اہلِ دیں بہ من آیا چہ احتیاج؟

اندرشتہ بھی ہیں:۔

روزِ عیدم چہ داد پیرِ مغاں
کہ صوابِ مہِ صیام گرفت

نوید ای نسیم از فصلِ گل دہ
لو بہ جیب و داماں تازہ گرداں

نمک اندر بہت بسیار بود است
عیارِ سینہ ریشاں تازہ گرداں

شہر کوراں است گویا شہر ما — بسکہ چوں نور از نظر ہا می روی
ہر کرا جانست پنہاں می رود — جان عالم آشکارا می روی

فارسی پر تفتہ کی قدرت حیرت انگیز ہے، یہ کم و بیش اہلِ زبان کی فارسی ہے، وہ فارسی ہندی نہیں جو منشیانِ ہند سے منسوب ہے۔

تفتہ کے دو نوحوں کا ذکر پہلے آچکا ہے در اصل یہ دونوں ان کے پورے دیوان پر بھاری ہیں، لڑکے کے غم میں تفتہ عقلی نکتہ سنجیاں بھول جاتے ہیں، دل پر چوٹ لگتی ہے تو وہ صدا نکلتی ہے، درد تاثیر اور روانی ان مرثیوں کی خصوصیات ہیں، خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ دونوں نوحے تمام و کمال نقل کر دیئے جاتے، حافظ کے وہ اشعار بے ساختہ یاد آتے ہیں جو انھوں نے اپنے لختِ جگر کی رحلت پر لکھے تھے:۔

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند — چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں
بجائی لوح سیمیں در کنارش — فلک بر سر نہادش لوح سنگیں

رباعیات اور قطعات معمولی ہیں:۔

الغرض تفتہ کو فارسی پر بڑا عبور رہا ہے، وہ بہت پُرگو ہیں اور بالالتزام قیود کو عاید کر کے کہتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ رسمی اور سپاٹ اشعار کی کثرت ہے، تفتہ ان شعرا میں ہیں جنکے یہاں جزو کل سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اگر تفتہ کے نو ہزار اشعار میں سے صرف پانچسو شعر منتخب کر لئے جائیں تو وہ مجموعہ ان کے دیوان سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوگا، زرِ خالص کی قیمت جب ہی نکلتی ہے جب اسے پگھلا کر الگ کر لیا جائے،

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تفتہ کا کوئی شعر اردو زبان میں دستیاب نہیں ہوگا، کہا جاتا ہے کہ اس زبان میں انھوں نے کوئی شعر کہا ہی نہیں آج سے ۹۰ سال پہلے متقدر ہنود میں فارسی

کی مقبولیت کا یہ عالم تھا، آج سے دس سال بعد (اندیشہ یہی) کہا جائیگا کہ ہنود میں سے کوئی اردو میں شعر نہیں کہتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ فارسی میں شعر کہتا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ اردو سے بے بہرہ ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کل ایک صدی میں نقشہ کتنا بدل جائیگا۔ ایک صدی کہنا بھی غلط ہے یہ المناک تبدیلی تو صرف ایک ربع صدی میں ہوئی ہے۔

پیغمبر کے نوحہ کا ایک بند ہے جس کی ردیف ہے "گذاشتی" اور قوافی محرم۔ مرہم وغیرہ اس کے دو اشعار پر ان سطور کا خاتمہ کرتے ہیں۔

وقتی کہ در قفائے تو صیاد فتنہ تاخت ای آہوئے جہندہ چرا رم گذاشتی
گور و رحم خانہ بسی ساختی بہ لہو بنیادِ عمرِ خویش نہ محکم گذاشتی

دوسرے شعر پر تین ص لگے ہوئے ہیں اور حاشیہ پر تفتہ کا پُر افتخار نوٹ ہے۔

این صاد ریختۂ خامۂ مولانا غالب است

اس سے ایک طرف غالب کے معیار کی بلندی اور ان کے تنقیدی خلوص پر روشنی پڑتی ہے کہ سینتیس سو اشعار میں سے صرف ایک شعر کو لائق اعتنا سمجھا، دوسری طرف تفتہ کی عقیدتمندی ظاہر ہوتی ہے کہ اسی ایک شعر کو اپنے لئے سرمایۂ کمال و سرچشمۂ افتخار سمجھا، یہی ظرف تھا جو خوبیٔ کمال میں خضر راہ کا کام دیتا تھا، اور فی زمانہ اس کا فقدان ہے جس کے باعث ہر نو مشق خود کو غالب ہی جانتا ہے، ہر قافیہ پیما خود کو زمرۂ اساتذہ میں شمار کرنے لگتا ہے۔ فنکاروں کی کثرت کا ظرف کی قلت سے براہ راست تعلق ہے۔

کلام تفتہ

ہیچ است قطرۂ ناچیز قلزم بکنار است دلِ ما
تفتہ از سپہر چہ می گوئی بود بیش از زمانہ دلِ ما

نیست کم ز انکار اقرار کسی   تا چه باید گفت انکار کسی
صد رتی دارد دریں دوران وفا   خاصه در هنگام اظهار کسی
گفتم نگفته ایم ما تا زنده ایم   گر ز رگ جان است زنار کسی
بر لب سخن روح فزا بود و نکردی   منظور ترا چاره ما بود و نه کردی
اکنون گله از جور فلک نفته چه حاصل   گویند که آه تو رسا بود و نه کردی
خوش به آن روی دلارا آمدی   خوش به این زلف چلیپا می روی
من گر از یاد تو هر دم می روم   تو نه از یاد من اصلا می روی
تیغ بر سر می زنی یا می نهی   رحم بر ما می کنی یا می روی
شد رها تیرت نشست و گفتمش   خون نه اما در اعضا می روی
پیر رهِ تو من بجان ای شیخ لیک   گر بگویے پیر ترسا می روی
می روی و می بری ما را از خویش   تا ندانیم از بر ما می روی
شیخ در میخانه اعجاز نیست نو   بی زبان آئی و گویا می روی
خوشتر از دانائیت نادانیست   آمدی اندر سهو و عمدا می روی
شهر کوران است گویا شهر ما   بسکه چون نور از نظر ها می روی
هر کرا جانست پنهان می رود   جان عالم آشکارا می روی
بگو که زلف مرا دست غیر آراید   گره ز کار فرو بسته ام چنین کشائی
نیستی آگر که اینجا چون حباب   دیده را تا میکنی وا نیستی
این مگو ای دل کی تنهائی بلاست   صد بلا با تست تنها نیستی
کشته کی بے نیازی ناز خوبان   سر عرض و غم نشنیدنی کو

منم بیمار و کار من تمام است / بباک پرسش ولی پرسیدنی کو

من این نه گویمت ای دل بهر دیار مرو / در آن دیار که غم نیست زینهار مرو

چه گفته که تو نا گفته هیچ کار مکن / مگو دگر که تو نا کرده هیچ کار مرو

نگه از پشت پا در حشر هرگز بر نمی خیزد / ز بار معصیت ها بسکه پشت من خمید اینجا

شدم از کعبه در دیر و چه گفتم خویش دیدم آنجا / یکی بود است رو اما سیاه آنجا سپید اینجا

می روم از درت غبار آسا / سیهم از ذلت گرانی ها

در لحد خواب می کنم من بیم / بر لب افسانهٔ جدائی ها

از تغافل نگاه او پیداست / دیده ام آن دیدن نهانی ها

از ازل در تو تا ابد با من / سست عهدی و سخت جانی ها

دل بدست مست دادن اهلیت / دارم از چشمت نهان آئینه را

گر دل پر آه و آه پر اثر باید خوشت / من دل بی آه و آه بی اثر دارم بیا

ای که گوئی از سیه باطن ظلم ترسیده آ / داشتم شامی که رفت اکنون سحر دارم بیا

یارب به صفای سینه ام محسن / داغی که درد بود چمن ها

بادیه پیما رنجم قند اشد / صد غم به بلبل و لفت تنها

ای نگاهبان کناره کر مفتول نیم ما / چشمان بی حیا دلبان گزیده را

باغی است که صد ارم فدایش / داغی که جگر گرفت ما را

باکشته گریه های خویشم / خون راه گذر گرفت ما را

عشرت کو نهین اگر از کف دهم دیوانه ام / من که ساقی جام مطرب ارغنون آرد مرا

صد ستم بر جان همین یک فتنه گر آورده است / صد بلا بر سر همین یک ذوفنون آرد مرا

عشق افگند بجائے کہ خلاف معمول
آب آتش بود و باد بود خاک آنجا

قدح می صفا دهد ما را
وان صفا تا چها دهد ما را

مدعائے سوال ما معلوم
یار پاسخ چرا دهد ما را

ما بسی دور رفتہ ایم از خویش
کہ بپائی زما دهد ما را

عقل رسم کدورت آموزد
عشق درس صفا دهد ما را

از ازل بود است با شفقت معمار عشق
تا ابد خاک خرابی بر سر تعمیر ما

خوش توبہ از حدیث بتان کردہ ایم ما
وز خاطر تو رفع گمان کردہ ایم ما

ہر کہ دل ز حق طلبید است کام جان
رو بسوئے غالب ہمہ دان کردہ ایم ما

امرد پرستی است و دگر تفتہ بیکشی
آن طاعتے کہ در رمضان کردہ ایم ما

عمرم تمام شد بہ تمنائے مرگ خویش
زین پس من و بہ مرگ تمنا گریستن

از غیر کینہ ورزی و از چرخ کجروی
از یار بے وفائی و از ما گریستن

آہنگ نالہ کرد دل و گفت دیدہ ام
باید بحال عرش علا گریستن

نمی گویم کہ جام بادہ در کش
فروغ روئے رندان تازہ گردان

حقیقت اے گریہ عمر نوح بخشد
حکایتہائے طوفان تازہ گردان

سبا افتد بہ دامان تو ہستم
جنون چاک گریبان تازہ گردان

نمک اندر لبت بسیار بود است
عیار سینہ ریشان تازہ گردان

نویدی اے نسیم از فصل گل دہ
نوید جیب و دامان تازہ گردان

مگو کایں تفتہ عمری چہ خواہد
تمنائی شہیدان تازہ گردان

ما در سپاس تشنگی خویش تر زبان
مردم گمان بوند کہ ز مزم کشیدہ ایم

بنگر که ضعف ما چه قدر زور دیده است   یعنی ملامت همه عالم کشیده ایم
ساقی قسم به حسرت می نیست جز خمار   آن تا کشید می که دمادم کشیده ایم
یا رب مباد زخم کسی را بهی نصیب   تا گفتنی است آنچه ز مرهم کشیده ایم
هر رگ پا سکانه نشتر می کشد   منت خار مغیلان بر طرف
بر امید لطف تا کی خط کشی   تیغ بر کش هم سلطان بر طرف
شمس آن کمال می گیرد   که خودش انفعال می گیرد
از ازل تا ابد نگفته شود   آنچه دل در خیال می گیرد
دل یکی دین عجب نگرگان را   خط گرفت است و خال می گیرد
گوشه است کز زمانه گرفت   دل ز مال و منال می گیرد
خرده ای که کس بکش گرفت   به من این خورده سال می گیرد
ماند دستی که از گریبان دور   دامن انفعال می گیرد
داد از چاک گریبان کسی   خنده ها بر صبح محشر می زند
عاشقم این بدگمانی را که او   حرف از معشوق دیگر می زند
یک عمر با تو ماندم و شد هر چه شد به من   اکنون که می روم به مدارا چه احتیاج
گفتی که مهر ورزم و منت نهم به تو   قربان گفتن تو به اینها چه احتیاج
ناز تو هر چه خواست ز دل دل به او سپرد   دارد کنون ادای تو با ما چه احتیاج
من گرد کفر گردم و اینها بگرد من   دارند اهل دین به من آیا چه احتیاج
داد از دست تیز دستی یاس   توسن شوق را ز مام گرفت
روز عیدم چه داد پیر مغان   که ثواب مه صیام گرفت

خط رخت را گرفت و گفت هوس — خطِ آزادی این غلام گرفت
لاله باغ سبزه خروئی هاست — هر که ساغر علی الدّوام گرفت
شیخ آمد به دیر و بت بشکست — تفته در کعبه رفت و جام گرفت

نوحه

(نوحهٔ لاله پتمبر سنگه پسر خود تفته مظلوم)

خواهم دگر ز خود به تظلّم بر آمدن — با چشم خون‌فشان به صف محشر آمدن
خواهم دگر ز مرگ بمنّت به فرط ضعف — بر دوش بیکسی به در داور آمدن
خواهم دگر به آن که بهم دل که برد و مرد — تا کی من و بجان ز غم دلبر آمدن
خواهم دگر به انجمن عالم پسر — با صد هزار درد به چشم تر آمدن

پیتمبر آنکه رفت و بخواهر نظر نکرد — رحمی بخسته جانی مسکین پدر نکرد
پیتمبر آنکه قافله‌اش را بهم زند — در نیمه ره ولی به برادر خبر نکرد
پیتمبر آنکه رفت و دم رفتن آن همه — گفتیم هر دم و به دل او اثر نکرد
پیتمبر آنکه از پی رفتن میان شب — گرد آنقدر شتاب که شب را سحر نکرد
پیتمبر آنکه دید چو خندان کسی مرا — دانست کاین چه خنده و چون دیده تر نکرد
پیتمبر آنکه بود هر اگرچه طفل اشک — یک از حیا خرام به بر رهگذر نکرد
پیتمبر آنکه جز به اجل همرهی نجست — پیتمبر آنکه جز ره تسلیم سر نکرد
پیتمبر آنکه بود نهالی و زین چمن — آمد به نشو بر بلید و که بید اثر نکرد
پیتمبر آنکه از من بیخود هم عتاب — نشنید بی شنیده سر از شرم بر نکرد
پیتمبر آنکه رنگ رخش چون کشود بال — چشمی بمن نکرد که خون صد جگر نکرد

واحسرتا که طفل من از من رمید و رفت   گفتم که حال زار مرا بین ندید و رفت
واحسرتا که هیچ کس این راز را نیافت   کانجا نهال باغ ارم چون دمید و رفت
واحسرتا که همسر که چو گل بُد جدا شدم   دامن بجاے گل نه چنین تلخ چید و رفت
واحسرتا که هیچ ز دنیا نخورد بر   انگشت حسرت آن که به دندان گزید و رفت
واحسرتا که گرم ره هم را نیافت کس   همپای اشک بود ز مژگان چکید و رفت
واحسرتا که رحم به غم خانه ام نکرد   آمد برون و داد بدستم کلید و رفت
واحسرتا که شد بغم مرگ چاک چاک   آن دامنی که شوخ ز دستم کشید و رفت
واحسرتا که تنگ جهان بُود در عدم   کان ناتوان بکہ صد جا خمید و رفت
واحسرتا که تیره گیم روشنی نیافت   شامم رسید و ماند و صباحم دمید و رفت

رفتی و پیشم از تو دوات و قلم هنوز   غمنامه هار و الفت به ملک عدم هنوز
چوبی کمان ز بود بدست تو وقت لهو   بود است و تیری فگند بر دلم هنوز
آن شانه کز تو پیش من سینه چاک ماند   یادم دهد ز زلف تو هر پیچ و خم هنوز
آئینه که بر سحرم بُود رو برو   بنمایدم ز روی ستم روی غم هنوز
من مشق گریه چون نکنم پیش لوح تو   کز دست تست ثبت در و صد رقم هنوز
تو زان گلی پیاله که می خوردی آب سرد   من دارمش عزیزتر از جام جم هنوز

اے رفته از نظر تو کجائی چگونه   میگفتی آنکه از چه نیائی چگونه
یائی نه رفتی از نظرم یا کنون کهی   در خواب نیز رخ ننمائی چگونه
یا بود خود ستا لفت پیش همه مال   با خویش را دمی نستائی چگونه
تا از تو من جدا شدم امید حیات نیست   تا از من اے پسر تو جدائی چگونه

تو خرد سال و راه عدم آنچنان که آه | اینجا بخوف پا بحبابی چگونه
کس این چنین نمی شد به دل جان فدائی گرگ | ای ماه صد جوانات فدائی چگونه
هر لحظه چون نه یافتی آیا چه شد ترا | هر دم چرا به ضعف گرائی چگونه
اے مانده سالها بکنار من این زمان | آغوش کی به من نکشائی چگونه
اے صحن و بام خانه دعاگوی مقدمت | بر بستر اوفتاده چرائی چگونه
کو مادرت که به سعادت از مهر کاری بسیم | اینم که درکنار بلائی چگونه

رباعیات

کی پیش دلم ره سلامت آمد | هرکس که آمد پئے ملامت آمد
از لب که به من زهر فهم آید آفت | گفتم یار آید و قیامت آمد

خود را ازین پس بره گذار تو کشم | جام از کف چشم پر خمار تو کشم
ای آنکه عدوئی تا زخوشی تا چند | ناز تو عدو و من انتظار تو کشم

یارب سر و برگ خرمی با نه بود | جز هجو زمانه بر لب ما نه بود
انیست غرض که از غرض رو تابیم | و نیست تمنا که تمنا نه بود

قطعات

موج و گرداب نشان ها دارد | تو ازین بحر نمی بیش نه
اے خجل پیش قبائی تو حباب | چشم بگشا که دمی بیش نه

هرچند نه چاره ای بگردون نرسی | هرچند سبک دوی بگردون نرسی
ره خاک شو از رتبه عالی هوس است | تا خاک نمی شوی بگردون نرسی

تشنہ

حافظ مولوی محمد یوسف خان نام تشنہ مرغوبی تخلّص وطن خاص بلند شہر تلمیذ فصیح الملک حضرت نواب مرزا داغ دہلوی آپ صاحبِ دیوان نامور اُستاد تھے۔

دمِ عرضِ مطلب وہ کہتے ہیں مجھ سے —— کہ تجھ پر ستم کوئی دن اور ہوگا
بہشتِ بریں میں بتا ہم کو واعظ —— ملاقاتِ باہم کا کیا طور ہوگا
ٹھہرنا ابھی ناصحِ مہرباں تم —— ئے روح پرور کا اک دور ہوگا

ایک ہی وار میں قاتل نے کیا کام تمام —— لفظِ تحسین بھی مرے منہ سے نکلنے نہ دیا

حالِ دل تشنہ نے کچھ کہہ کر رلایا رات بھر —— کس کی مژگاں نے الٰہی دل میں نشتر رکھ دیا

عکس آئے گا نظر ماہیِ بیتاب کی شکل —— مہر کرنے کو جو وہ شوخ لبِ جو ہوگا

ذرا یہ بھی اے چارہ گر دیکھ لینا —— تڑپتا ہے دل یا جگر دیکھ لینا
تڑپنا مرے دل کا ہنگامِ رخصت —— خدا کے لئے اک نظر دیکھ لینا
کوئی ہو نہ ہو زیرِ بام اُن کے لیکن —— انہیں غرفے سے جھانک کر دیکھ لینا

رنج ہے روز و شب جدائی کا —— ہو بُرا ایسی آشنائی کا
اس کی بیداد کا ہو کیا شکوہ —— جو ستمگار ہو خدائی کا
دیکھئے کس طرح سے بنتی ہے —— شور ہے اُس کی بے وفائی کا
بندہ پرور بتا دیا دل نے —— آپ کو ڈھنگ دلربائی کا

ہمارے دل سے جو درد و فغاں بلند ہوا —— ہوا یہ غل کہ اثر سے وہ بہرہ مند ہوا
تمام عمر کے شکوے مٹا دئیے دل سے —— یہ کہہ کر آپ نے کہ تو کب سے درد مند ہوا
مریضِ غم کا جو درماں نہ ہو سکا تشنہ —— تو الحفیظ کا غل چار سو بلند ہوا

کچھ بھی کرنے نہ دیا پنجۂ وحشت نے ہمیں
ٹانکا دامن کو جو ہم نے تو گریباں نکلا

جب عدم سے سوئے ہستی دلِ ناشاد آیا
پیشوائی کے لئے عشقِ خداداد آیا

جب کبھی لے کے چھری ہاتھ میں صیاد آیا
طائرِ کنجِ قفس کو بھی خدا یاد آیا

جستجو تم کو مری کیوں ہوئی کچھ تو کہدو
کیا کوئی تازہ ستم اور تمہیں یاد آیا

ہمسری کرکے خدا سے جو بنائی تھی بہشت
موت کا کوئی نہ چارہ تجھے شداد آیا

ایک دم بھی نہ میں فردوس میں ٹھہرا آشفتہ
مجھ کو گلزارِ مدینہ جو ذرا یاد آیا

تڑپا کیا ہوں ماہئِ بے آب کی طرح
فرقت میں اے اجل تجھے آنا ضرور تھا

اپنے مجروح کو بیہوش جو دیکھا تو کہا
اس کے زخموں پہ نمک خوب سا چھڑکا ہوتا

شستہ گوئی کو کیا ترک تو کیا اے آشفتہ
چھوڑتے الفتِ دنیا کو تو زیبا ہوتا

بزمِ جاناں سے نکلنے ہی نہیں دیتا رقیب
یہ بھی کیا کمبخت میرے دل کا ارماں ہو گیا

اس دل کے سو علاج کئے تو نے چارہ گر
پر یہ حریصِ لذتِ آزار ہی رہا

دونوں جہاں سے کھو دیا آشفتہ کو عشق نے
کافر رہا تو نہ یہ دیندار ہی رہا

کھلا راز جب اس کو کسی دل جلے نے
تو شعلہ کی صورت سرِ طور نکلا

خدا نے دی ہے وہ عظمت زمینِ کعبہ کو
قصور وار گیا اور بے قصور آیا

اس بزم کا ہے نام یہاں گورِ غریباں
جس بزم میں وہ رونقِ محفل نہیں ہوتا

عمر بھر ہم تری زلفوں کے رہے سودائی
فرق اس میں نہ ذرا بال برابر نکلا

دل کہیں، دیدہ کہیں، ہوش کہیں، تاب کہیں
اس طرح کوچۂ جاناں سے میں باہر نکلا

ساقی نے جام کیا مرے منہ سے لگا دیا
گویا کہ جزو کل کا تماشا دکھا دیا

دیوانہ کر رہی ہے کسی گلبدن کی یاد
رکھا ہوا ہے ورنہ گل و یاسمن میں کیا

شاگرد جب سے بلبلِ ہندوستان کا ہے	آتا نہیں ہے تشنہ کو فنِ سخن میں کیا
اب تو اے تشنہ لعبِ حضرتِ ذوق	داغ ہے بادشاہ اس فن کا
اڑاتے خاک ہیں ان کے لئے سب	سند بھی ہے آج کل ان کی ہوا کیا
وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتے ہیں	ہماری آرزو کیا مدعا کیا
لو آج شبِ غم کے ہیں اطوار نرالے	اب جینے کا ناصح گماں ہو نہیں سکتا
رابطہ ان سے بڑھا کے دیکھ لیا	گرم سرد آزما کے دیکھ لیا
شیخ کے منہ کو لگ گئی آخر	بادۂ خوش گوار کیا کہنا
خلق میں کر دیا مجھے رسوا	اے دلِ بے قرار کیا کہنا
آج طوفانِ نوح دیکھ لیا	دیدۂ اشکبار کیا کہنا
قطرہ دریا سے ہم آغوش ہوا	اے دُرِ شاہوار کیا کہنا
عذر ہر اک وصل پر وہ کہتے ہیں	آپ ہیں خواستگار کیا کہنا
قسمتِ تشنہ کو بے نشان کیا	اے مرے شہسوار کیا کہنا
یہی حسرت رہی تا مرگ ہم کو	کہ اک دم بھی تجھے بھلا نہ پایا
زبانِ دہلوی پہ لکھنؤ نے	کیا جھگڑا مگر دہلی نے پایا
کس زمانہ میں ظہور اپنا ہوا اے تشنہ	نظر آتی ہی نہیں اہلِ نظر کی صورت
نصیحت حضرتِ ناصح سے گئے بھول	ملے پھر جب دو چار گستاخ
بھری محفل سے اٹھوایا نہ آخر	نکلنا تھا تجھے اے دل سمجھ کر
بات کا مول ہے زمانہ میں	گھٹ گیا تیرا اعتبار افسوس
مجھے تو پہلے ہی سوجھی تھی لئے بیٹھا رہا	کہ رنگ لائی گی بختِ سیاہ کی گردش

رشکی:-

محمد علی خاں نام - رشکی تخلص آپ عالیجناب نواب محمد مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے خلف اکبر تھے، آپکا انتخاب کلام مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا ہے، اور آپ کا دیوان نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب ایم - ایل - اے - کے پاس محفوظ ہے -

نواب صاحب فارسی اور اردو میں بے تکلف شعر کہتے تھے، ایک کتاب فارسی میں بطرز گلستان بھی لکھی ہے، اور امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کی اکثر غزلیں تضمین فرمائی ہیں ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو

تہی از غیر محفل بود شب جائے کہ من بودم   بری از وسوسہ دل بود شب جائے کہ من بودم
تقرب خاص حاصل بود شب جائے کہ من بودم   نمیدانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

گلشن میں کوئی دید کے قابل نہیں رہا   وہ درد خیز شور عنادل نہیں رہا
کیا بے محل نزول تجلی حسن ہو   سینہ داغ و دل کی قابل نہیں رہا
مجنوں طبیعتوں کا فقط راہبر ہے شوق   گرچہ سراغ نالۂ و محمل نہیں رہا
رشکی کی آپ چل کے زیارت تو کیجئے   یہ ہے غلط کہ اب کوئی کامل نہیں رہا

بیقراری ہے کم ہماری آج   کیا نظر پڑ گئی تمہاری آج
کیا کہا بیخودی میں اس بت نے   گئی برسوں کی دینداری آج
شمع نے رشک روئے روشن سے   جل کے کاٹی ہے رات ساری آج
وہ منانے کو آئے ہیں رشکی   نبھ نہیں سکتی وضعداری آج

ہے اس طرح رخ روشن نقاب میں داخل   کہ جیسے ہو مہ انور سحاب میں داخل
نہ خانقاہ میں رونق نہ میکدہ آباد   ہوئے کب آکے جہان خراب میں داخل

ہمارے قتل کو عدا ثواب کہتے ہیں — خدا کرے کہ تمھیں ہو ثواب میں داخل

جب سے عریانی ہوا اپنا لباس — جامہ سے باہر ہوئے جاتے ہیں ہم
ہم سے بڑھکر کوئی دیوانہ نہیں — دل سے دیوانہ کو سمجھاتے ہیں ہم

اس عنایت کے بھی قابل یہ گنہگار نہیں — سینکڑوں خون کیا کرتے ہو دو چار نہیں
یار کے قدموں کی تکذیب سزاوار نہیں — ورنہ ظاہر میں محبت کے کچھ آثار نہیں
اس کے کوچہ میں مری خاک پڑی ہے دیکھیں — جو یہ کہتے ہیں کہ اب کوئی وفادار نہیں

مے پی نہیں کہ مست ہوئے بادہ کش تمام — ساقی کے رخ کا عکس پڑا ہے شراب میں
آئے تو ان سے حال کچھ اپنا کہہ نہ سکا — کیا جانے ہو گیا کب مجھے اضطراب میں
آئے نظر جو چشم حقیقت نگر ملے — جو ہے حجاب میں وہ نہیں ہے حجاب میں

پیشتر وقت سے مرنا ہو وہ امکاں میں نہیں — اور جینا بھی کچھ آساں شب ہجراں میں نہیں
کس سے فریاد کریں تیرے شہیدان نگاہ — عفو کی خو ہی ترے ناوک مژگاں میں نہیں
غیر کو بھی ہے سر دشت نوردی شاید — وہ مزا اب خلش خار مغیلاں میں نہیں
عشق رنگی کا زمانہ سے جدا ہے گویا — بندۂ بت ہے مگر فرق کچھ ایماں میں نہیں

مزا الفت کا جان زار سے پوچھ — یہ نکتہ واقف اسرار سے پوچھ
مرے پامال ہونے کی حقیقت — خود اپنی شوخئ رفتار سے پوچھ
ہمارا درد دل کچھ ہم سے سن لے — کچھ اپنی نرگس بیمار سے پوچھ

وہ روشنی جو آپ کے رخ کی نقاب ہے — کہتے ہیں اس سے نور ربا آفتاب ہے
بہائے زخم میرے بہت تشنہ کام ہیں — دیکھیں تو کس قدر ترے خنجر میں آب ہے

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے — غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مے پلائی اگر نہیں منظور — ابر کیوں بار بار آتا ہے
ترے رونے سے اب مجھے بھی خوف — دیدۂ اشکبار آتا ہے
درد دل کیا بیاں کروں رشکی — ان کو کب اعتبار آتا ہے

بے خود تپش نے دل کی کیا اسقدر مجھے — کوئے عدو میں آج ہوئی ہے سحر مجھے
وہ ہے ہجوم یاس کہ ہوتا ہے ناگوار — ناصح سے بھی سوا سخن نامہ بر مجھے

حذر اس نرگس سحر آفریں سے — کہ جو فتنہ ہے اٹھتا ہے وہیں سے
نہ اٹھیں گے در پیر مغاں سے — کہ سب کچھ ہم نے پایا ہے یہیں سے
ہزاروں مہر و الفت کی ادائیں — سمجھ لیتے ہیں ہم تیری نہیں سے
کہیں گے کیا جو شوخی سے کبھی وہ — ہمارا ماجرا پوچھیں ہمیں سے

بے مثالی ہے ترے حسن کا اک جوہر ذات — کون عالم میں ترا مثل و مقابل ٹھہرے
جلوہ افروز ہو جس بزم میں وہ غیرت ماہ — شمع کس طرح سے پھر رونق محفل ٹھہرے
عشق اک آگ ہے اور آگ پہ لئے شیشہ گرو — کہیں سیماب بھی ٹھہرا ہے جو یہ دل ٹھہرے
بے نشانی سے ہوں مطلوب کی اپنے حیراں — کون سی راہ سر جادۂ منزل ٹھہرے

صبا میں اس گل رعنا کی ہے جو بو باقی — بہار کی نہیں اب دل میں آرزو باقی
دیا ہے پنجۂ غم نے ہزار بار فشار — دل حزیں میں ہے لیکن ہنوز لہو باقی
وہ آج ہاتھ میں تلوار لے کے آئے ہیں — خدا کرے رہے الفت کی آبرو باقی
یہ سینہ ریش ہے رشکی غم جدائی سے — کسی جگہ نہیں گنجائش رفو باقی

رسا:-

منشی حیات بخش رسا۔ ممتاز الشعرا خطاب۔ نواب فصیح الملک داغ کے شاگرد اور جانشیں

سکندر آباد ضلع بلند شہر وطن، فرخ آباد میں عدالت کلکٹری میں پیشکار تھے، داغ مرحوم کے انتقال کے بعد جانشینی کا مسئلہ پیش ہوا تو ہز ہائینس نواب حامد علیخاں نے آل انڈیا مشاعرہ کیا، اس مشاعرہ میں رسا صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، ہز ہائینس نے مصاحب خاص اور شاعر دربار مقرر فرمایا، اور دو تکمیل دربار کیا، انتخاب کلام حسرت موہانی نے شائع کیا، مولانا محسن صاحب کاکوری کے تمام قصائد کو تضمین فرمایا ہے قصائد اور دوسرے اساتذہ کی غزلیں تضمین کی ہیں، شاگردوں کی کثیر تعداد چھوڑی ہے جن میں جگر مراد آبادی حسن نعیمی۔ سالک بٹالوی اڈیٹر انقلاب۔ تاجور نجیب آبادی۔ نشتر مقتدری۔ تاج امروہوی۔ نجم آفندی وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، سنہ ۱۹۱۷ء میں رامپور میں انتقال فرمایا۔

اُن کا رُخ کھلتے ہی غارت ہو گئے انوارِ صبح
کیا غضب ہے دن دہاڑے لٹ گئی سرکارِ صبح

منھ تمھارا دیکھ کر دیکھے کوئی آثارِ صبح
عید ہے اس کیلئے جسکو ہو یوں دیدارِ صبح

ایک دن کا ہو جو یہ رونا تو کرلیں صبر بھی
رات دن کیونکر سنیں انکار شب انکار صبح

یہ موذن ہے، موذن آپ کا نوکر نہیں
کیا غرض ہے نصف شب سے کیوں کرے اظہارِ صبح

صبحدم وہ بے نقاب اٹھے جو خوابِ ناز سے
روئے انور پر تصدق ہو گئے انوارِ صبح

اَب تو پیری ہے کہیں توبہ بھی کر مردِ خدا
سو بلاؤں کو رسا کھوتی ہے استغفارِ صبح

محبت یہ ہے آدابِ محبت نام اس کا ہے
کہ لب تک لا نہیں سکتا ہوں جو دل کی تمنا ہے

نہیں ہے بات کرنے کا بھی دم مجھ میں فغاں کیسی
مرا ضبطِ محبت میری مجبوری کا پردا ہے

کسی گھر کا نہ رکھا ہم کو اس آشفتہ حالی نے
کہیں ہم ہیں کہیں دل ہے کہیں دل کی تمنا ہے

رہی ہر وقت چپ رہنا رہی ہر اک کا منھ تکنا
تری تصویر کیا ہے میری حیرانی کا نقشا ہے

بیٹھ کر پردہ میں تو محو خود آرائی نہ ہو
آئینہ کے بھیس میں کوئی تماشائی نہ ہو

ہم سیہ بختوں کا جانا حشر میں اچھا نہیں
صبح محشر سے بدل کر شام تنہائی نہ ہو

دن بھی فرقت کا یوں ہی کٹتا ہی روتے پیٹتے
اپنے جی میں تھوڑی شام تنہائی نہ ہو

تھام کر دل انکو رخصت کر تو دوں مشکل یہ ہو
ساتھ ساتھ اُن کے کہیں رخصت شکیبائی نہ ہو

میرے جینے سے بھی ناخوش ہیں کہ یہ مرتا نہیں
میرے مرنے سے بھی ڈرتے ہیں کہ رسوائی نہ ہو

دور سے دیکھ رہے ہیں وہ تماشا کس کا
حسرتیں آج اُٹھاتی ہیں جنازا کس کا

یاالٰہی کہیں میری شب ہجراں تو نہیں
کر دیا صبح قیامت نے سویرا کس کا

کسی کا عکس جبیں ساغر شراب میں ہے
اک آفتاب کی تصویر آفتاب میں ہے

ادھر ہے شوق تغافل ادھر حجاب میں ہے
ہمارے دل کی تمنا بڑے عذاب میں ہے

یہ کوئی بات ہی ہر کم سنی میں یہ پردا
ترے حجاب کے دن ہیں جو تو حجاب میں ہے

مجھے تو شرم گناہوں کی تجھ سے ہی یارب
تجھے حجاب ہے کس سے جو تو حجاب میں ہے

شراب پیتا ہوں توبہ کو رکھ کے مد نظر
گناہ کرتا ہوں لیکن نظر ثواب میں ہے

جگر میں اُٹھے کہ دل میں کہاں کہاں اُٹھے
کسے کا درد محبت بڑے عذاب میں ہے

مجھے کچھ اور بھی کمبخت کے سوا کہیے
کہ یہ تو لفظ ازل سے مرے خطاب میں ہے

رسا بھی آیا ہے محشر میں داورِ محشر
گناہگار بھی حاضر تیری جناب میں ہے

ہاں ہاں ضرور صدمے دشمن کی جان پر ہیں
جب اپنی جان پر ہیں سارے جہان پر ہیں

اُف تک نہ نکلی منھ سے گو صدمے جان پر ہیں
ہم بھی ہیں باد ادا لے اپنی زبان پر ... ہیں

اس طرح چپ کھڑے ہیں وہ مجھکو قتل کر کے
گویا تمام صدمے ان ہی کی جان پر ہیں

تم عرض مدعا پر میری زبان نہ کھینچو
ہاتھوں میں چبھ نہ جائیں کانٹے زبان پر ہیں

لئے گئے ہیں سجدے نقش قدم پہ تیرے
شکر انے ان کا ہر ایک ایک نشان پر ہیں

کس ڈھب کے آدمی ہیں یہ حضرت رسا بھی
سو بار توبہ کرنے کی دو کان پر ہیں

چھپ گیا کوئی دکھا کر شکل لاثانی مجھے
دے گیا سیدہ دکیسا درد پنہانی مجھے

دل کے ہاتھوں اب یہاں تک ہے پریشانی مجھے
غیر سے کہنا پڑا ہے رازِ پنہانی مجھے

عمر بھر رو تا رہا اپنی پریشانی کو میں
اب مری تربت پہ روتی ہے پریشانی مجھے

میرے رونے کی حقیقت کس طرح ان پر کھلے
جس دم آئے وہ تو پایا خندہ پیشانی مجھے

داورِ محشر کے آگے اب کہوں تو کیا کہوں
ڈال کر پانی گلے ہیں کر دیا پانی مجھے

پہلے مجھ حیرت زدہ کا یہ کبھی نقشہ نہ تھا
تم نے کھنچکر کر دیا تصویرِ حیرانی مجھے

وہ جوانی کی امنگیں اے رسا سب مٹ گئیں
آب تو پیری میں ہے شغل سبحہ گردانی مجھے

مرتے دم قول و قسم وعدہ وفائی کے ہوئے
کب سلیقے میری آہوں کو رسائی کے ہوئے

دونوں عالم میں ہوئی عشق کے ہاتھوں ذلت
نہ خدا ہی کے ہوئے ہم نہ خدائی کے ہوئے

دشت میں پیچھے گئے سب وقت رکھا میں نے قدم
خار ممنوں مرے آبلہ پائی کے ہوئے

تجھے دیکھو کہ بندہ ہو کے نافرمانیاں لاکھوں
اسے دیکھو کہ وہ کچھ بھی نہیں کہتا خدا ہو کر

باغ میں چھوڑ دیا آپ نے آنا جانا
چشمِ نرگس کو بھی کیا چشمِ تمنا جانا

دل شکستہ جو میں ہو کر تری محفل سے اٹھا
پھر نہ دل سے کہیں بیٹھا نہ کہیں دل سے اٹھا

وہ میرے دل میں آتے ہیں بڑھانے آرزو دل کی
ٹھکانہ اب دلِ دشمن میں کیجئے آرزو دل کی

بس ایک قطرہ لہو کا رہ گیا ہے جسم کے پہلو میں
اسی کو دل سمجھ لو تم اسی کو آرزو دل کی

وفا والوں کا بندہ ہے ادا والوں کا بسمل ہے
رسا کا دم بھی کیا دم ہے رسا کا دل بھی کیا دل ہے

بدلی ادھر نظر تو ادھر بھی بدل گئی
ان کی بہار ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں چل گئی

محشر میں بھی یہی بت کافر کی چل گئی
یہ کیا ہوا امید جزا سے عمل گئی

ایسی کسی مریض کی حالت زبوں نہ ہو
سر پیٹتی ہوئی مرے گھر سے اجل گئی

مجرم سے اور پرسشِ اعمال حشر میں
کیونکر کہوں کہ شانِ کرم ہی بدل گئی

نقشِ قدم سے اُن کے یہ حاصل ہوا عروج
کوئے عدو میں خلقِ خدا سر کے بل گئی

پہلے تو اس نے دل کو مرے چاک کر دیا
پھر کہہ دیا کہ جا تری حسرت نکل گئی

ساقی جو دئے جائے یہ کہہ کہہ کے پئے جا
تو میں بھی پئے جاؤں یہ کہہ کہہ کے دئے جا

جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دئے جا
اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کئے جا

ان کو مری حالت کا یقیں آئے نہ آئے
اس واسطے قاصد مری تصویر لئے جا

وہ عرضِ تمنّا پہ یہ منہ پھیر کے بولے
ارمان کئے جا ابھی ارمان کئے جا

ہم سے تو شبِ غم کی مصیبت نہیں اٹھتی
اے خضر مبارک ہو تجھے تو ہی جئے جا

کمبخت رسا تیری رسائی نہیں اُن تک
تو خوب سا اس نام کو بدنام کئے جا

دل چلا لوٹ کے جو وقت تھے تیر کے ساتھ
حسرتیں پھوٹ کے روئیں مری تقدیر کے ساتھ

تم جو تقدیر میں ہوتے تو شکایت کیا تھی
کچھ ہمیں ضد تو نہ تھی کاتبِ تقدیر کے ساتھ

تم تو ہنس کھیل کے غیروں میں گزارو اپنی
مری تقدیر کا رونا مری تقدیر کے ساتھ

تم نے پھر روزنِ دیوار سے جھانکا مجھ کو
چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دلگیر کے ساتھ

اپنی آنکھوں سے یہ نقشہ نہیں دیکھا جاتا
اُن کی تصویر کھنچے غیر کی تصویر کے ساتھ

کیا خاک ہم کسی سے کہیں ماجرائے دل
ایک بوند رہ گئی ہے لہو کی بجائے دل

اُن کا ہر بات پہ تصویرِ حیا ہو جانا
کہہ رہا ہے کہیں وعدہ کا وفا ہو جانا

ایک نہ ایک دن ہمیں پامال وفا ہونا ہے
زندگی تو دکھا دینگے فنا ہو جانا

اب کہیں جلد پہنچ بابِ اثر تک اے آہ
کچھ نہ بن آئے تو دشمن کی دعا ہو جانا

لیجئے جان تو حاضر ہے مگر شرط یہ ہے
آج سے قائلِ اربابِ وفا ہو جانا

خورشید:-

قاضی غیاث الدین احمد نام۔ خورشید تخلص حضرت مولانا محمد حسین صاحب ثاقب دہلوی کے شاگرد تھے، اکثر مرزا ممنون کو بھی غزلیں دکھائی ہیں، حضرت داغ و امیر و راسخ کے مشاعروں میں شرکت کی ہے، سکندر آباد وطن ہی ایک ضخیم دیوان اور ایک بڑا درسوخت یادگار چھوڑا۔ سکندر آباد میں بعمر ستر سال وفات پائی۔ مرتے دم تک فکر سخن سے فرصت نہ ہوئی۔ نہایت حسین اور باوضع انسان تھے اور روز و شب ان کی صحبت میں شعر و سخن کا ہی تذکرہ رہتا تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کانوں میں ہوئی نہ ہیں یاسمن کے پھول — ہیں آج تیرے کشتۂ رنج و محن کے پھول
اپنی جگہ پہ بھاری ہے پتھر بھی ہے مثل — جبتک رہے چمن میں رہے لالۂ چمن کے پھول
اتنا سبک اٹھا ہوں کہ یاروں کے دوش پہ — میت کفن میں ہے کہ ہیں اندر کفن کے پھول
کملا کے دل میں کہتی ہیں دو دن کیواسطے — مرجھا کے ہم تو گر گئے افسوس بن کے پھول
سیر چمن میں وہ گل رعنا نہیں جو ساتھ — ہم کو تو خار سے بھی ہیں بدتر چمن کے پھول
وحشت میں آج خار بیاباں ہیں دلفگار — روندے تھے کل جو پاؤں سے ہم نے وطن کے پھول

عجب کچھ رنگ زمانہ کا ہوا ہے خورشید — جو نہ سنتے تھے کبھی آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں

یہ کیا انداز مانا ہی ادا اس کو نہیں کہتے — کبھی برسوں میں آ نکلے وفا اسکو نہیں کہتے

ہم آپ اپنے پاؤں کو زنجیر کر چلے — دل کو اسیر زلف گرہ گیر کر چلے
بچ بچ کے ذکر خوبی تقدیر کر چلے — مر مر کے جان دینے کی تدبیر کر چلے
گشت جگر کریں کہ جگہ بھی فراخ ہے — تنگی دل کی سیر تیرے تیر کر چلے
نقشے ہمارے شوق کے بیکار سب ہوئے — فقرے وہاں رقیب کے تاثیر کر چلے
گزریں بہت شبیہ پہ دیکھا نہ تیرا عکس — دل کو بھی ہم مرقع تصویر کر چلے

زباں پر منھ کی تنگی سے ہر ایک حرفِ سخن بگڑا
بہت ہی اپنے منھ سے آج وہ غنچہ دہن بگڑا

جہاں کے کبک اور طاؤس و خوباں چال سب بھولے
خرامِ ناز سے تیرے زمانہ کا چلن بگڑا

ادا ساری ہی اچھی تھی بنا کر آپ کو کھویا
ذرا دیکھو تو آئینہ کہ سارا بانکپن بگڑا

زلیخا پر رہے آخر وہ سب الزام کے دھبے
کہاں یوسف کا داغِ معصیت سے پیرہن بگڑا

شہادت کی شہادت گو رہیں ہر ساتھ محشر تک
ترے کشتہ کا خون زخم سے سارا کفن بگڑا

فروغِ حسن سے تیرے نہیں ہے شمع کو نسبت
ترا اٹھنا تھا محفل سے کہ رنگِ انجمن بگڑا

نہیں سلطانِ دوراں قدر افزائے سخن خورشید
بھلا کیا نثر سنورے نظم گوئی کا تو فن بگڑا

لہو کب زخمِ سینہ سے بھرا ہے آ کے داماں میں
جگر کا چاک بڑھتے بڑھتے جب آیا گریباں میں

جنوں کے ہاتھ سے دامن کئی ہیں پرزہ داماں میں
بہت سے چاک ہیں اک چاک کے بدلے گریباں میں

برق :-

قاضی نجم الدین نام۔ برق تخلص۔ وطن سکندر آباد۔ حضرت تسکین کے شاگرد تھے، اور حضرت ممنون سے بھی مشورہ فرمایا ہے، بعض اساتذہ کا قول ہے کہ حضرت مومن کو بھی اپنا کلام دکھایا ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

پیرِ میخانہ ہے تسکین برق اس کا جرعہ کش
ہے مزا اس کے سخن میں بادۂ انگور کا

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے بہادر شاہ بادشاہ کے دور کے آخری مشاعرہ کا تذکرہ لکھا ہے اس میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی وہ یہ ہے :-

تو اگر وحشتِ دل قوتِ بازو ہو جائے
پائے شل میں ابھی پیدا رمِ آہو ہو جائے

وا جو گلشن میں ترا عقدۂ گیسو ہو جائے
غنچہ غنچہ گرہ نافۂ آہو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

منھ لگا کرتا تھا اعجازِ مسیحا جس کا — ہلے ہیں پر ملک الموت کا قابو ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑھے — ورنہ تو پردہ اٹھائے تو تو ہی تو ہو جائے
تو نہ ہوگا تو ترا درد رہے گا دل میں — یہ نہ ہوگا کبھی خالی مرا پہلو ہو جائے

گلے ملنا مجھے یاد آگیا کس جانِ عالم کا — کہ مجھ کو عید کا دن ہو گیا عشرہ محرم کا
ترے جاتے ہی ابتر ہو گیا سب کھیل عالم کا — طلسمات جہاں گویا تماشا تھا ترے دم کا
نہ روؤں جب تلک تسکیں مرے دل کو نہیں ہوتی — فقط اک زندگانی کو سہارا ہے ترے غم کا

بہار آئی ترو تازہ گلستاں ہوتے جاتے ہیں — بلائے جان شورِ عندلیباں ہوتے جاتے ہیں
رخوں پر بال زلفوں کے پریشاں ہوتے جاتے ہیں — تماشائی گلستاں سنبلستاں ہوتے جاتے ہیں
پھر اُن کی بزم میں اغیار مہماں ہوتے جاتے ہیں — ہماری جان کے جانے کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
ہوا ہے شوق اُن کو عاشقوں کے قید کرنے کا — سلاسل بنتے ہیں زنجیرِ زنداں ہوتے جاتے ہیں
تڑپتا ہوں جو درد دل ہی میں اے برق رہ رہ کر — وہ اپنی دلبری پر اور نازاں ہوتے جاتے ہیں

بل پڑا غصہ میں اُنکی ابروئے خمدار پر — اور اک تلوار پیدا ہو گئی تلوار پر

دل چور تھا زخموں سے مرا ٹکڑے جگر تھا — شب رخ تری مژگاں کا خدا جانے کدھر تھا
کیوں ضبط کیا دیکھ کے بیتاب اُسے ہائے — شب لب پہ جو نالہ تھا وہ سرگرم اثر تھا
شب غیر میں اور ہم میں بھی یوں ہی لڑائی — دیکھا تو وہ بے دید نہ ادھر تھا نہ اُدھر تھا
کس واسطے خوش آئی تجھے دل کی خرابی — اے خانہ برانداز یہ تیرا ہی تو گھر تھا
وہ بھی نہ رہا جوشِ محبت میں الٰہی — پہلے جو مری آہ میں تھوڑا سا اثر تھا
اب کیوں کہ کہوں صبر کرلے دل کہ مجھے تو — تیرا ہی بھروسہ ہی فقط اے آہِ سحر تھا
وہ وقت نہ پایا کہ کہیں حال دل اپنا — جب دیکھا انھیں آئینہ ہی پیشِ نظر تھا

خیال:-

حکیم مولانا سید شمس الحق صاحب نام۔ خیال تخلص۔ وطن گلاؤٹھی ضلع بلند شہر۔ تقریباً پینسٹھ سال کی عمر میں بعارضہ فالج ریاست رامپور میں انتقال فرمایا۔ مزار واقع قبرستان متصل جھنڈا بڑے پیر صاحب ہے۔

عالم ہونیکے علاوہ فن طب میں کافی دسترس حاصل تھی، شاعری میں حضرت مولینا امیر احمد صاحب امیر مینائی کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ مولانا خیال صاحب کی روانی طبع۔ قصائد۔ رباعیات قطعات۔ نعت۔ مناقب۔ سلام و مرثیہ میں یکساں جلوہ گر ہے۔

گلشن میں فصل گل کے جو ساماں نہ دیکھتے — عقل و جنوں کو دست و گریباں نہ دیکھتے
تنگ اے جنوں جو گوشۂ زنداں نہ دیکھتے — ہم آنکھ اٹھا کے سوئے بیاباں نہ دیکھتے
کنج قفس میں خون رلاتی ہے یاد گل — اے کاش ہم بہار گلستاں نہ دیکھتے
صدمے ہزار ہوتے گوارا تھے سب مگر — داغ فراق صحبت یاراں نہ دیکھتے
صبح وطن کی یاد میں روتے ہیں رات دن — چلتا جو بس تو شام غریباں نہ دیکھتے

مانگوں جو میں خوشی تو ہو رنج والم نصیب — مجھ سا بھی ہو زمانہ میں کوئی نہ غم نصیب
قسمت جدا جدا ہے ہر اک کی جہان میں — پایا کسی کو ہم نے کسی کا نہ ہم نصیب
رو رو کے اپنی عمر گذرتی نہ کس طرح — ہم مثل شمع بزم جہاں میں تھے غم نصیب
ہر دم یہی دعا ہے خدا سے مری خیال — ہو حشر میں شفاعت شاہ امم نصیب

اٹھا را لاکھ اس پر بھی نہ اٹھا انکی محفل سے — بہت شرمندہ ہوں اے ضبط میں بیتابی دل سے
مثال گرد اٹھتے بیٹھتے پہنچے ہیں مشکل سے — اٹھا لے درد دل ہم کو نہ اٹھنے کو [illegible] قاتل سے
چھری بن کر اتر جاتا ہے سر چلتا ہوا نقرہ — تری [illegible] کو کوئی لے چھپے مرے دل سے

در منعم پہ رہ جاتی ہے اپنے سر کو ٹکرا کر — نہ ہوگا بڑھ کے درماندہ کوئی آوازِ سائل سے
کیا تھا منع دیکھ اچھا نہیں ہر دم وہاں جانا — خیال آخر پریشاں ہو کے نکلا انکی محفل سے

ہو گیا بدنام دنیا بھر میں رسوا ہو گیا — عشق میں جو کچھ نہ ہونا تھا خدایا ہو گیا
ایک میں ہوں عمر بھر نکلی نہ کوئی آرزو — ایک تم ہو تم نے جو جس وقت چاہا ہو گیا
گرد باد آسا پریشاں پھر رہے ہو کیوں جناب — یہ تمہارا حال کیا ہے یہ تمہیں کیا ہو گیا

زمانہ میں نہیں مجھ سے کسی کو التفات اصلاً — بنایا ہے مقدر نے مجھے آوازِ سائل کی
سرِ محفل جلی ہے شمع اپنی آگ میں شب بھر — خدا محفوظ رکھے کیا بری ہوتی ہے لگی دل کی

تم شمع کو کیوں جلا رہے ہو — مہمان ہے غریب رات بھر کی

بہت ہی پاؤں پھیلائے ہیں اس نے بحر احمد میں — مقید ضبط کے زنداں میں یا اللہ ہونیوالا ہے
محبت ماسوا کی ترک کر کے قلب سے اپنے — کوئی دن میں وصالِ اللہ والا ہونیوالا ہے

بارِ عصیاں لیکے جب ہم جانب محشر چلے — دو قدم چل کر گرے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے
گرمیٔ روزِ قیامت سے بچا جاتا ہوں میں — ہاں مئے کوثر کا دور اے ساقیٔ کوثر چلے
شوقِ دیدارِ مدینہ میں جو روئے زار زار — ناتوانِ عشق سیلِ گریہ میں بہہ کر چلے

فروغ :

کنور بدری کرشن نام۔ فروغ تخلص۔ سکندر آباد وطن۔ ان کے مورث اعلیٰ سر بالاجی راؤ سیندھیا کے یہاں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ وہیں سے حسن خدمات کے صلہ میں جاگیر بھی حاصل کی اور راجہ کا خطاب پایا جو اب تک اس خاندان میں چلا جاتا ہے۔ فروغ صاحب دہلی میں وکالت کرتے تھے۔ شاعری میں ہرگوپال صاحب تفتہ سے تلمذ تھا، اردو فارسی دونوں زبانوں میں بے تکلف شعر کہتے تھے، علم عروض میں ایک کتاب بھی لکھی

دیر صبح ہو گئی

اثر تھا برقِ مضطر کا یہ کس وحشی کے شیون میں
نسیمِ صبح کیوں سر دُھن رہی ہے کس کا ماتم ہے
وہ ہے جوشِ جنوں لپٹنے لگے بڑھ کے آبلے سر پہ
چمک اٹھے زمیں پر آفتابِ حشر کی صورت
نہیں دیتی اجازت شوخیٔ پردہ نشیں ہنسنے کی
دلِ اہلِ جہاں تسخیر کرتے ہیں اشاروں میں
چمک اٹھا ہے کیا نورِ جبیں سے جلوۂ عارض
ہوا معمور آج مالا مال جوشِ اشکِ خونیں سے
لکھا ہیں عاشقوں کی داستاں بس گی بے حجابانہ
ہمارے گوہرِ مضموں ہیں تارے عرشِ اعظم کے
فروغِ نکتہ داں سے ہو گئی افزوں زینتِ محفل
ہمیں کیوں آ رہا ہے غش تجلی کس کی دیکھی ہے
قربان جو انکے رخ پہ ہوئی ہے سمن کی شاخ
مضموں کے گل کھلانے لگے اب شاعرانِ دہر
بزمِ شراب میں کبھی آئیں گے شیخ جی
بے فیض جس قدر ہیں وہ سرکش ہیں دہر میں
بیٹھے ہوئے ہیں پہلوئے پیرِ مغاں میں وہ
تعلیم گاہِ دہر میں جانے لگے فروغ

میت
قیامت کی بھری ہیں بجلیاں صحرا کے دامن میں
گریباں چاک ہیں گل کس کے غم سے آج گلشن میں
اگر کاں خار تھی باقی رہا صحرا کے دامن میں
گرے جو آنکھ سے آنسو خیال آئے روشن میں
بٹھا رکھا ہے کیوں شرم و حیا نے ان کو چلمن میں
قیامت کا بھرا ہے سحر ان کی چشمِ پُرفن میں
نظر آیا ہمیں اک ماہِ کامل روزِ روشن میں
حصولِ کان و دریا جمع ہے سب میرے دامن میں
اٹھا دو پردۂ در کو لگا دو آگ چلمن میں
یہ وہ موتی ہیں جو ہوتے نہیں دریا کے دامن میں
مزہ آئے گا اہلِ بزم کو بے ساختہ پن میں
ظہورِ برقِ ایمن ہے یہ کس کے روئے روشن میں
صدقہ سمن کی شاخ پہ ہے نسترن کی شاخ
باغِ جہاں میں سبز ہے نخلِ سخن کی شاخ
کھولی ہے ہم نے خلد میں اس انجمن کی شاخ
گلشن میں سر بلند ہے سروِ چمن کی شاخ
سر سبز ہو رہی ہے درختِ کہن کی شاخ
کھولیں گے یہ بھی مدرسہ مکر و فن کی شاخ

ابر

مولوی سید فضل علی نام۔ ابر تخلص۔ آپکے والد ماجد کا نام قاضی سید اکبر علی۔ آپ بلند شہر میں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور اردو فارسی و عربی کی اعلی تعلیم حاصل کی۔ شاعری کے علاوہ علم ریاضی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے گورنمنٹ ہائی اسکول بلند شہر میں ماسٹر رہکر پنشن حاصل کی۔ شاعری جو آپ کا فطری جذبہ تھا۔ اس کی تکمیل کیلئے فارسی میں حضرت مرزا غالب دہلوی اور اردو میں حضرت مومن دہلوی کے دائرہ تلمذ میں داخل ہوکر استفادہ حاصل کیا۔ لبسا اوقات قلعہ معلی کے مشاعروں میں شرکت فرمائی۔ اور ضلع بلند شہر کے اپنے معاصر اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے ۱۹۰۵ء میں تقریباً ۸۶ سال کی عمر میں بلند شہر میں رحلت فرمائی۔
آپ کا مندرجہ کلام جو زمانہ کی دست برد سے دستیاب ہوا ہے وہ پیش کیا جارہا ہے۔

ہم یہ سمجھے تھے کہ دو چار ہی قطرے ہونگے — سیلِ خوں تجھ سے تو اے دیدۂ گریاں نکلا
سر کٹا اور کفن تک نہ ملا وائے نصیب — میں ترے کوچہ سے کیا لے کے سروساماں نکلا
ایک ہی سانس میں ہستی سے عدم میں پہنچے — جو سفر سمجھے تھے دشوار وہ آساں نکلا
تیرے ہی ہاتھ ہے اے بلبل شیدا انصاف — کوئی بھی ابر سا گلشن میں غزلخواں نکلا

نکلی برقعے سے جو اس رشکِ قمر کی صورت — دھوپ پھیکی ہوئی مہتاب سحر کی صورت
بے وطن کون ہوا دیکھ غریبی میں کہ آج — صورتِ شامِ غریباں ہے سحر کی صورت
ہاتھ سے کیا کسی خورشید کا دامن چھوٹا — ابر کیوں چاک گریباں ہے سحر کی صورت

ہار کر مجھ کو وہ کب سر بگریباں ہوں گے — ایسے کس روز ہوئے تھے کہ پشیماں ہوں گے
مدد اے مرگِ غریبی کہ نہیں رشک کی تاب — رخصت اے زیست کہ وہ [illegible] ہونگے
دن کو مسجد میں رہے رات کو بت خانہ میں — بت پرست آپ ہے ہرگز نہ مسلماں ہوں گے

خوش ہوا ہے دل کہ ترا عقدۂ مشکل کھولا
بند وہ تیغ کا اس نے سرِ محفل کھولا

نیند سے آپ اٹھے یا کہ اٹھا فتنۂ حشر
آنکھ کھولی کہ درِ جا آئے بابل کھولا

بحرِ اسود کیا گنگا کو ہوئی صبح کی شام
جوڑا بالوں کا جو اس نے سرِ ساحل کھولا

حباب اک ہی فلک یا رب ترے دریائے حکمت کا
ہے ایجادِ دو عالم اک کرشمہ تیری صنعت کا

ابھی ساحل پہ کشتی جا لگے طوفانِ عصیاں سے
ہوا یہ تو جو کھولے بادباں اپنی عنایت کا

نہیں زیبا ہے مشتِ خاک کو اے ابر خود بینی
پڑا ابلیس کی گردن میں اس سے طوق لعنت کا

بہار آئی ہے ساقی جوش پر سرخی ہے لالے میں
چمن پھولے لگا ہوں ہیں وہ دارو دیے پیالے میں

عیاں ہے عکسِ عارض حلقۂ زلفِ پیچاں سے
تماشا ہے کہ ہیں سو ماہِ کامل ایک ہالے میں

ادا سے روحِ لذت پا کے تن میں رقص کرتی ہے
نگہ سے جان آتی ہے الٹ کر مرنے والے میں

شاید یہی ہے ابر کہ مدت سے رات کو
اٹھ اٹھ کے کوئی روتا ہے پچھلے پہر کہیں

عرضِ مطلب پہ جو ہوتے ہیں خفا ہونے دو
دوستو چھیڑ تو کافر سے ذرا ہونے دو

زاہدو العبد گنہ حکم ہے توبہ کا ضرور
پہلے مے نوشی کی سرزد تو خطا ہونے دو

واہ ری خوبیٔ تقدیرِ عنادل کہ ہنوز
گل کو جی بھر کے نہ دیکھا تھا کہ صیاد آیا

باراں :-

سید ولایت علی نام۔ باراں تخلص۔ آپ حضرت مولوی سید افضل علی صاحب ابر کے پسرِ اکبر تھے۔ آپ سنہ ۱۸۸۲ء میں بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدا میں اپنے والد ماجد حضرت ابر سے فیضانِ شاعری حاصل کیا۔ بعدہٗ حضرت مفتی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے سامنے زانوئے ادب طے کر کے اپنے مذاقِ شعری کی تکمیل کی۔ آپ اپنے معاصر شعرا میں بہت مقبول تھے۔ آپ کا کلام حضرت امیر مینائی کا آئینہ دار ہے۔ ہنوز آپ کا کلام طبع نہ ہونے پایا تھا کہ تقریباً پچاس سال

کی عمر میں بلند شہر میں انتقال ہو گیا۔ آپ کا سن وفات ۱۹۲۹ء ہے۔ ادارہ مندرجہ ذیل
اشعار فراہم کر سکا جو پیش کئے جاتے ہیں۔

میری ہر بات جھوٹی مجھ کو نہ بیچے کی الفت ہے
تمھیں کیسے کو بڑتی ہے زمانہ کی نظر کس پہ
نہیں پھرتا کوئی ہم ہیں اگر پیچھے پھر اٹھ کر
تو پھر یہ چاک ہوتا ہے گریبان سحر کس پہ

سوتے میں جب لے پاؤں زلفیں ہی کیا چھو لیں
ڈوبی ہوئی خوشبو میں یا آج یہ کیوں ہے
سیکھ لیتا تری رفتار سے انداز نیا
فتنۂ حشر کو ٹھوکر سے لگا رکھا تھا

آ کر مری نگاہ میں جلوہ دکھائے کون؟
جب تم سما چکے تو نظر میں سمائے کون؟
پوچھا کسی سے اس نے کہ یاراں تمام رات
کرتا ہے روز تھام کے دل ہائے ہائے کون؟

کچھ تو آخر دل سے دل کو راہ ہونی چاہیے
آہ یاں نکلی وہاں دل اسکا مضطر ہو گیا
سب بیتا ہوگا جو گردش ہی خط تقدیر میں
آستانے پر ترے جس دن مرا سر ہو گیا

تبسم سے وہاں خالی نمکداں ہوتے جاتے ہیں
یہاں زخم جگر رس رس کے گریاں ہوتے جاتے ہیں
تمھارے مصحف عارض سے اتنا ربط گیسو کو
خدا کی شان ہے کافر مسلماں ہوتے جاتے ہیں
کہاں الفت کہاں یاراں کہاں صحبت حسینوں کی
یہ جلسے عیش کے آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

ہم پہ کس روز ترا ناوک بیداد نہیں
یہ ہمارا ہی کلیجہ ہے کہ فریاد نہیں
سوتے سوتے پھر وہی عادت بری تجھ کو لگی
پھر اسی کوچہ میں تم یاراں نظر آنے لگے

زلفیں سنبھالئے مجھے ڈر اپنا ہو گیا
چلتی بنے گی چھیڑ کے بادِ صبا کا کیا
اب تم بتوں کو چھوڑ دو یاراں خدا کو لو
دنیا کو منہ لگاؤ نہ اس بیسوا کا کیا

نکل کر کھڑا ہوں میں یوں گھر سے باہر
تم آ کر نہ پھر جاؤ باہر سے باہر
بڑھ گیا درد سوا ضبطِ فغاں سے یاراں
نکل گیا اور بھی جو حال چھپایا دل کا

صمیم

سید علی حسین صمیم بریلی کہنہ مشق اور زودگو شاعر تھے۔ حضرت بیان یزدانی میرٹھی سے تلمذ حاصل تھا۔ "جلوۂ سخن" اور "نعت میں" "دربار رسول" دو دیوان اپنی حیات میں شائع کرائے۔ ریاست رام پور اور بعد میں ریاست مالیر کوٹلہ کے شاعر دربار رہے اس کے بعد عرصہ تک بلند شہر میں ڈسٹرکٹ گزٹ کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کے فرائض انجام دیئے۔

سالک وہ ہوا مسلکِ اکرام و کرم کا
اسرار کھلا سلسلۂ راہِ ارم کا

زیبِ حسن جلوۂ شمعِ حرم تو ہی تو تھا
یادگارِ کتبۂ لوح و قلم تو ہی تو تھا
کھنچے نقشِ عالمِ اسباب سے جاتے نہ کیوں
یادگارِ صفحۂ شوقِ رقم تو ہی تو تھا

کچھ اور ہی اس شوخ کا اندازِ ستم ہے
کچھ بڑھ کے جفا میں فلکِ پیر سے تھا

اشارے لیتے دل کو نگاہیں بن بن کے ناوک
یہ کیا جادو ادائی تھی یہ کیا انداز بسمل تھا

کیا کیا دعائیں مانگیں بر سوئے ہاتھ اٹھا کر
اپنا تو آسماں سے اب تک نہ کام نکلا

تھوڑی بہت پیجیے ساقی سے بحث کیا
جو مل گیا سمجھ کے مقدر اٹھا لیا

ذرا دور سے اک جھلک ہم بھی دیکھیں
سرِ طور سمجھا گیا وہ جلوہ نکھارا

دل سے بلبل کے ذرا پوچھیے بربادیٔ گل
ہائے کس طرح خزاں نے یہ چمن لوٹ لیا

یہ پیار رنگ ہے محبت کا
میں جو روٹھا تو ان کو پیار آیا

دعویٰ ہے جو اعجازِ مسیحا تم کو
زندہ تو کرو کشتۂ تیغِ ستم اچھا

میرے عیب جس قدر تھے وہ ہوئے پسندِ خاطر
یہ کیا ہے نکتہ چیں نے عجب انتخاب الٹا

بل ابرو پہ رخ پہ عرق سرخ چشمِ ناز
اللہ کیا بناؤ ہے ان کے ملال کا

چھپ گیا زلفوں میں رخ انکا اٹھا ہی تھی نقاب
کچھ اجالا سا نظر آ کے اندھیرا ہو گیا

اللہ رے غرور نہ دیکھا کبھی ہمیں
گزرے ہیں لاکھ بار اسی رہگذر سے آپ

گلشن کے پھول اور ہیں عارض کے گل ہیں اور
پوچھیں چمن میں چل کے نسیم سحر سے آپ

رہ رہ گئی ہر گام پہ اٹھ اٹھ کے قیامت
تھم تھم کے چلے جب وہ سر راہگذر آج

ہیں بس کے وہ دن عیش کے کل تک تھے جو ہمراز
رو رو کے گزرتی ہے بری طرح مگر آج

نقش ہیں دل پہ جو اک حسن کی تصویر کے خط
کیا عجب ہے کہ مٹائیں مری تقدیر کے خط

ناتواں ہو کے بھی پابندئ وحشت نہ گئی
مٹ گئے پاؤں مرے زنجیر سے زنجیر کے خط

[illegible] آنکھ اور نہ تھی پہ لگا ہیں [illegible]
[illegible] طرح ہیں تمھیں [illegible]

[illegible] اٹھا لیے ٹھوکر کا نہ سمجھو لیں [illegible]
ایسا ہی ہم بنا ہیں [illegible]

کلیوں کے لب پہ [illegible] دہن کی ہے
تھم تھم کے [illegible]

جس دل کا کوئی گاہک ہی نہیں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں بازاروں میں ہم

کہتے ہیں خضر سے رہ ظلمات اور ہے
آنا سنبھل کے کوچۂ گیسوئے یار میں

قرض لیکے پی تو چڑھی اور بھی سوا
دونی ملی ہے مفت کی لذت ادھار میں

تم کیا چلے زمیں چلی آسماں چلے
ٹھہرو ذرا اٹھا کے قیامت کہاں چلے

قدا

نام مولانا عبدالوحید صاحب۔ قدا تخلص۔ شاگرد حضرت فصیح الملک مرزا داغ دہلوی۔ مئی سنہ ۱۹۴۲ء میں قصبہ گلاوٹھی اپنے قیام گاہ پر تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مولانا موصوف کے والد سید حیات اللہ صاحب تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم والد صاحب کی سرپرستی میں ہوئی۔ مولانا کو اردو فارسی میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا مرزا صاحب مرحوم کے نامور تلامذہ میں سے تھے، خود مولانا صاحب کے تلامذہ کا

حلقہ بہت وسیع ہے۔ مولانا عرصہ چالیس سال تک مین پوری کلکٹری میں ملازم رہے مولانا احسن مارہروی حضرت سائل دہلوی سید امیر حسن مارہروی بیخود دہلوی وغیرہ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے، مولانا کی طبیعت میں ظرافت شوخی آخر دم تک رہی۔

خود بخود جو نظر آئے وہ تماشا ہوں میں ۔۔۔ آپ ہی آپ کو سمجھ جائے وہ نقشا ہوں میں
زخم دل میں جسے رکھے ہیں وہ ناوک ناز ۔۔۔ دل جسے سر پہ اٹھا لے وہ تمنا ہوں میں
میری تربت میں مرے ساتھ ہیں لاکھوں جلوے ۔۔۔ بیکسی تجھ کو یہ دھوکا ہے کہ تنہا ہوں میں
ہوں وہ لیلیٰ کہ دل قیس ہے محمل میرا ۔۔۔ اور وہ .... قیس کہ اندر دل لیلیٰ ہوں میں
سامعہ سن نہیں سکتی مری سرگوشی کو ۔۔۔ لامسہ چھو نہیں سکتی وہ اچھوتا ہوں میں
شامہ بو سے دل آویز ہے میری محروم ۔۔۔ ذائقہ [illegible] وہ حلوا ہوں میں
ہیں صدائیں یہ ہمہ اوست کے پردے کی فدا ۔۔۔ ورنہ کیا چیز ہوں میں خاک کا پتلا ہوں میں

آئے تو کس بہار سے گل کدۂ مجاز میں ۔۔۔ سینکڑوں پھول کھل گئے گلشن امتیاز میں
شوق فنا میں آ گئیں جھک کے مری نیاز مندیاں ۔۔۔ انکا بھی ہے پتہ کہیں آپکے کوئے ناز میں
آہ مری پلٹ پڑی ان کی نگاہ دیکھ کر ۔۔۔ میرا ہی تیر کھنچ گیا ان کی کمان ناز میں
مجھ کو جھکائے آئیں کیوں آپکی بے نیازیاں ۔۔۔ میری نظر اور آئینہ تھا میرے سر نیاز میں
جسکو اشارہ مل گیا اس کا نصیب کھل گیا ۔۔۔ لے گئی شان یہ کمال ابروئے کارساز میں
حشر کا نام مل گیا حشر نے گود لے لئے ۔۔۔ فتنے جو تھے پلے ہوئے ان کے خرام ناز میں

کتنی معصوم شکلیں ہیں ترے دیوانوں کی ۔۔۔ صبح کھاتی ہے قسم ان کے گریبانوں کی
جوش گریہ تجھے کن آنکھوں سے دیکھا ہوگا ۔۔۔ خاک بھی اڑنے نہ دی تو نے بیابانوں کی
لے لیا گود میں اک دست کرم نے آ کر ۔۔۔ گردن اٹھنے بھی نہ پائی تھی پشیمانوں کی

چھالے تلووں میں مرے پھونک کے رکھتی ہے قدم — گرم مجلس ہی ترے سوختہ سامانوں کی
حسرتِ دید یہ الزام حضوری کیوں ہے — خیریت پوچھنے آیا ہوں نگہبانوں کی
وہ تو سنتے ہی نہیں کون چھڑائے یارب — بیگناہی کو مری قید سے بہتانوں کی
لے ہی بیٹھے تھے انھیں جوشِ جنوں کے ہوکے — بات رکھ لی تری زلفوں نے پریشانوں کی

آہیں بھی ہو گئیں رخصت نالوں نے بھی گھر چھوڑا — بھاگ گئے نہ کہیں تنہا گھبرا کے شکیبائی
عشاق کے سینوں میں دل ہے نہ کلیجہ ہے — اللہ یہ آپ کیوں ہے پلکوں کی صف آرائی

چلمن تک ان کے جانے کی ہمت نہیں پڑی — جھونکے صبا کے دور سے در دیکھتے رہے
تیرِ ادا کے زخم دکھاتا چلا گیا — جدّت پسندِ دل کے ہنر دیکھتے رہے
بزمِ عدو میں لطف رہا شوقِ دید کا — ہم ان کی وہ ہماری نظر دیکھتے رہے
تیرِ ادا کو سینۂ بسمل سے کھینچ کر — وہ بار بار خونِ جگر دیکھتے رہے

چمن کے مرغوں سے آندھیوں کی سوجھ رہی — اڑیں کاندھے پہ لیکر اپنے تابوتِ نشیمن کو
مرے نالوں کی چالاکی کہ بن کر نغمۂ دلکش — اڑایا اپنے فقروں میں نواسنجانِ گلشن کو

تو ہی کہہ دے تجھے پیمان شکستہ کی قسم — کس کو میرا سا یقیں ہے ترے پیمانوں کا
ٹوٹ کے آئینہ دکھایا جو وفاؤں نے مری — منہ ذرا سا نکل آیا ترے احسانوں کا
کھینچ رہی ہے مری ٹوٹی ہوئی توبہ مجھ سے — کہے نقشہ ترے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا
آبلوں میں بھی نہ کچھ سوزِ دروں نے چھوڑا — گھر کا گھر پھونک دیا سوختہ سامانوں کا
کون لیجائے گا بھر کر دلِ پُر داغ کے پھول — اک ذرا چھوٹا سا دامن ترے پیکانوں کا
لذتِ زخم نہیں حد سے گذرنا اچھا — ذائقہ تلخ نہ ہو جائے نمک دانوں کا
خونِ دل دیکھ کوئی ان میں پیاسا نہ رہے — قافلہ جائے گا اس راہ سے ارمانوں کا

مہر:-

عبداللہ خاں تپش کے والد۔

نیاز محمد خان نام۔ مہر تخلص۔ غلزئی پٹھان تھے۔ ایک عرصہ تک آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر رہے۔ ظریف طبع اور زندہ دل تھے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں ۴۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا آپ کی صرف ایک غزل بمشکل دستیاب ہوئی ہے

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی — نہیں ہوتی، سحر نہیں ہوتی
آسماں راہ پر نہیں آتا — آہ کیوں رخنہ گر نہیں ہوتی
کشتۂ چشمِ مست کو ان کے — حشر کی بھی خبر نہیں ہوتی
زخمِ دل کے رفو سے کیا حاصل — خوں میں سوزن بھی تر نہیں ہوتی
آتے ہیں لختِ دل فضاؤں کے ساتھ — آہ کیوں پُر اثر نہیں ہوتی
مہر کو مہر تھی زمانہ سے — روشنی قبر پہ نہیں ہوتی

رخشاں۔

عزیز الدین نام۔ رخشاں تخلص۔ قاضی زادگان جیورہ سے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں جیورہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شعر و سخن کا شوق اپنے والد قاضی حسام الدین آزردہ سے ورثہ میں ملا۔ مڈل پاس کرکے وہ گوالیار اپنے ماموں حافظ فضل احمد سے فارسی کی متداول کتابیں بڑی محنت سے پڑھیں، انٹرنس تک انگریزی تعلیم حاصل کرکے ریاست کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوگئے۔ گوالیار میں اس زمانہ میں کافی علم دوست حضرات کا مجمع تھا۔ مولوی غلام غوث وحید، قاضی مقصود حسن حسرت۔ گلاب رائے شبنم۔ پروفیسر نارائن پرشاد مہر۔ مولوی ریاض احمد ریاض بدایونی اور مضطر خیرآبادی قابل ذکر ہیں۔ رخشاں بزم شعرا کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ گوالیا

کے اکثر مشاعروں میں۔ احسان شاہجہان پوری۔ رسا سکندرآبادی۔ وجاہت جھنجھانوی
ذوق لاہوری۔ جوشش جے پوری شرکت فرمایا کرتے تھے۔ مضطر خیرآبادی نے ایک بہت
بڑا مشاعرہ کرایا جس میں اساتذہ وقت کو بلایا گیا جس میں سائل دہلوی وغیرہ نے شرکت کی
رخشاں مرحوم سنہ ۱۹۱۸ء کے اکتوبر میں جیورا جا کر عالمگیر وبائی مرض انفلوئنزا میں مبتلا ہوئے
اور آٹھ روز بیمار رہ کر چھتیس ۳۶ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

میں کیا کہوں فراق میں کیا کیا الم ہوا — آرام کا تو نام بھی سننا قسم ہوا
کیفیت فراق سے حاصل ہوا سرور — جو داغ تھا جگر کا وہی جام جم ہوا
رخشاں شکایتوں سے تھی ان کی یہ غرض — جب اپنی منتوں پہ بھی غصہ نہ کم ہوا

کہہ رہا ہے زمانہ کیوں سفاک — آپ کا نام تو مسیحا تھا!

رہتا نہیں سلامت مارا ہوا انھیں کا — اک زلف عنبریں کا اک چشم سرمگیں کا
پیدا جو ہو گئی ہے تھوڑی سی بیقراری — قائل ہوا ہے ظالم اب آہ دل حزیں کا
گو کوچہ صنم سے جنت میں آ گیا ہوں — آنکھوں میں پھر رہا ہے نقشہ مگر وہیں کا

قیامت میں دکھاؤں گا اثر جب سوز پنہاں کا — جہنم کو جلا دے گا شرارہ آہ سوزاں کا
قیامت میں یہ دے گا گواہی میری وحشت کی — کفن میں لے لیا ہے میں نے اک ٹکڑا گریباں کا
چلو تم دشت وحشت میں پوری شکل دکھلا دو — بگولوں میں نظر آئے مرے حال پریشاں کا
عزیز الدین ہوں رخشاں تخلص ہے وطن جیورا — سخن گوئی میں ہوں شاگرد احسان سخنداں کا

کوئی روز فرقت میں ایسا نہ ہوگا — کہ جس میں تمہیں ہم نے ڈھونڈا نہ ہوگا
کریں ہم صفت غیر کی وہ بھی جھوٹی — وہ شکوہ کریں آپ تو بیجا نہ ہوگا

تو نہیں آتا تو اپنی یاد ہی کو بھیج دے — بے خبر تجھ کو خبر بھی ہے میں کس حالت میں ہوں

جان دیکر جان لاکھوں آفتوں سے چھٹ گئی ۔ موت جب سے آ گئی مجھکو بڑی راحت میں ہوں
آفتابِ حشر کا رخشاں مجھے کچھ ڈر نہیں ۔ بن خدا نے دو جہاں کے سایۂ رحمت میں ہوں

خدا کے سامنے کس کے نہ داد خواہ کوئی ۔ بتوں کے حشر میں یہ انتظام ہوتے ہیں

رخشاں ذرا بچائے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں ۔ کانٹے بچھے ہوئے ہیں حسینوں کی راہ میں

کسی کی نوکِ پلک بھی خلش کا باعث ہو ۔ کھٹکتی رہتی ہے مانندِ خار آنکھوں میں
تمھاری آنکھ جھپکتی نہیں کسی صورت ۔ وہ کام کرتی ہے اپنا ہزار آنکھوں میں

[illegible] ہے کوئی ۔ تری یاد سے دل کو [illegible] ہیں
[illegible] آپ بھی نہ اٹھے تو جائیں ۔ مری لاش کو آ کے [illegible] ہیں
آ دیکھ [illegible] شوقِ زیارت بھی رخشاں ۔ مدینہ کو ہم [illegible] جا رہے ہیں

عاشقِ زار آپ کا رسوا تو ہے ۔ ہر جگہ حسن لئے جیسے رخشاں تو ہے
دخترِ رز کی پاک صورت دیکھ کر ۔ حضرتِ واعظ کا دل بہکا تو ہے
جس کو تم عاشق سمجھتے تھے کبھی ۔ یہ وہی رخشاں تو ہے رسوا تو ہے

ہمیں جو خاکِ قدم خوش خرام کر لیتے ۔ پھر اٹھا حشر تو جھک کر سلام کر لیتے
فلک کے جور سے بچتے اگر ترے مجبور ۔ شبِ فراق کے صدمے تمام کر لیتے
اسی کا ہے ہمیں افسوس رات دن رخشاں ۔ چمکتا بخت تو دنیا میں نام کر لیتے

ہمارے دل سے جب آہ رسا نکلتی ہے ۔ نکالے منہ سے بتو بد دعا نکلتی ہے
مجھے رقیب کی چاہت جتا کے کیوں چھیڑا؟ ۔ مرے بھی منہ سے کچھ اب بیوفا نکلتی ہے
کسی کے دیدۂ مخمور کا ہوں متوالا ۔ ہوس شراب کی اب دل سے کیا نکلتی ہے
وہ حسن لائے درخشاں ہر ایک کا اے رخشاں ۔ کہ جس سے شمس و قمر کی ضیا نکلتی ہے

وہ چشمِ مست جب سے سرشار ہو گئی ہے — زہاد کی جماعت مے خوار ہو گئی ہے
ترچھی نگاہ جب سے خونخوار ہو گئی ہے — ساطور ہو گئی ہے تلوار ہو گئی ہے
سنبل سے ہمسری ہو اب کس طرح سے ممکن — زلفِ رسا تمھاری طرار ہو گئی ہے

الجھائیے نہ زلفِ گرہ گیر سے مجھے — دیوانہ ہوں میں باندھئے زنجیر سے مجھے
آیا تھا کوئی ناصیہ سائی کے واسطے — سجدہ کا اک نشان ترے سنگِ در میں ہے
صبر و قرار لے کے بھی دل سے گیا نہ عشق — چوری گیا ہے مال مگر چور گھر میں ہے
لو اب تو دیکھ آئیے تم اپنے مریض کو — کیا فرق اس میں اور چراغِ سحر میں ہے؟

ہجر

مولوی محمد حسین صاحب ہجر قاضی غلام حیدر صاحب جیوری کے پانچویں فرزند تھے اپنی خاندانی روایات کے خلاف آپ نے بیس سال کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہیں کی محض معمولی حرف شناس تھے۔ ایک روز ایک بہشتی نے اپنا خط آپ سے پڑھانا چاہا۔ آپ اٹک اٹک کر پڑھ رہے تھے کہ آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالرحمٰن صاحب تمنا نے دیکھ لیا۔ اور از رہِ طعن کہا کہ تم کیا پڑھو گے لا مجھے دے۔ آپکو اس قدر غیرت آئی کہ گھر سے اسی وقت بے اطلاع خالی ہاتھ پا پیادہ دہلی چل دئیے، راستہ میں پیاؤ پر پانی پلانے والوں کو تاکید کرتے گئے کہ اگر کوئی پوچھتا آئے تو پتہ نہ دینا گھر والے پریشان ہو کر مایوس ہو گئے، اور یہ سمجھ لیا کہ خودکشی کر لی۔ آپ دہلی بہ وقت شام پہونچے، اور جامع مسجد کے پیش امام صاحب سے اپنے شوق تحصیل علم کا ذکر کیا اور مدد چاہی، انھوں نے مولانا امام بخش صہبائی سے تعارف کرایا، جنھوں نے اولاً بہت ہمت توڑی مگر پھر اپنی کوشش سے اُن کے گزارہ کی سبیل کر دی، اور خود پڑھایا، آٹھ برس تک سخت محنت کے بعد تکمیل علم کی سند لی، اور شاہی مدارس میں ہی ملازم ہو گئے، حسن اتفاق سے دیوان صاحب کشمیر کو اپنے صاحب زادہ کیلئے اتالیق کی ضرورت ہوئی صہبائی صاحب

نے آپ کو کشمیر بھیجا۔ دیوان صاحب سے دیگر مصارف کے علاوہ دس ہزار روپیہ طے ہوئے تھے بچہ کی تعلیم کے بعد انھوں نے کچھ کم دینا چاہا، آپ نے مولانا صہبائی کو اطلاع دی اور کشمیر سے بغیر اجازت کے معاودت فرمائی، مولانا صہبائی کے نام جو دیوان کشمیر کی شکایت آپ نے لکھی تھی اس میں ذیل کا جملہ بہت دلچسپ ہے۔ "دیوان با من ہماں کرد کہ محمود بہ فردوسی"۔

کشمیر سے واپس آکر آپ نے پھر شاہی مدرسہ میں اپنی سابقہ جگہ لے لی۔ آپ کی واپسی دہلی کے چند روز بعد ہی دیوان صاحب کشمیر نے مولانا صہبائی کے پاس حسب قرار سابق پوری رقم کافی تالیف قلب اور معقول معذرت کے ساتھ بھجوا دی۔ کچھ عرصے کے بعد مہاراجہ تکوجی راؤ ہولکر والی اندور کے اتالیق مقرر ہو گئے، چنانچہ جب مہاراجہ صاحب تعلیم سے فارغ ہوئے اپنے شفیق استاد کو ناظم اعلیٰ اندور مقرر کیا، آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، اندور اور جیور میں زمین اور سکنی جائداد پیدا کی۔ فارسی زبان پر آپ کو اس درجہ قدرت و مہارت حاصل تھی کہ جملہ اصناف سخن میں آپ کا کلام موجود ہے اور آپ کے کلام کو قبولیت خاطر اور ذوق دل کے ساتھ سنا اور پسند کیا جاتا تھا اور ہم عصر اساتذہ آپ کے مداح اور آپ کی استعداد کے معترف تھے

بہ یاد روئے تو خلوت در انجمن دارم — ز بس خیال تو با دیگرے چہ کار مرا
تو نیز چارۂ حرماں نمی توانی کرد — بہ جلوہ آئی و حیرت برد ز کار مرا
چہ آتش است ز سوز جگر تہ خاکم — کہ اخگر است سراسر گل مزار مرا
نفس شمارم و ہرگز ز شیشہ ساعت — تہی نمی شود از دل دمی غبار مرا
چناں ز خویش نفورم کہ خاکم از پس مرگ — ز پی بباد نیاید بہ دل غبار مرا
ز داغ بادہ شود ہمچو لالہ زار تنم — شکست توبہ بود عہد نو بہار مرا

زبس شوخی سرشکم را قرارے نیست در چشم بلے در خانہ کے آرام باشد طفلِ بدخو را
لطفِ اندازِ عتابش برد عالم را ز خویش موجِ ساغر چیں بود بر جبہۂ بے باکِ ما
ما بہ ذوقِ گریہ سرسبز ایم مانندِ سحاب مایۂ صد جوشِ طوفان ست مشتِ خاکِ ما
گر بہ شوید تیرگی ہائے گناہِ عاشقاں بحر باشد ابرِ رحمت دیدۂ غمناکِ ما

ز دودِ آہِ سوزانم غبارے گر شود پیدا تو گوئی از سپہرِ نیلگوں اختر شود پیدا
گدازِ دل بہ کف آور چہ تاثیرِ نفس خواہی سرِ گم گشتۂ ایں رشتہ از گوہر شود پیدا
دمِ کشتن اگر لعلش درِ اعجاز بکشاید ز موجِ خونِ بسمل چشمۂ کوثر شود پیدا
نمی دانم چہ سوزے در جگر دارم کہ از چشمم سرِ مژگاں بہ جائے اشک یک اخگر شود پیدا
خیالِ چشمِ مے گونش اگر در سر چنیں باشد برنگِ نرگس از مستی ز سر ساغر شود پیدا
بنہ دستے دمے بر سینۂ ہجرِ جنوں پرور مبادا از نالۂ او شورشِ محشر شود پیدا

دل بے خود ست مستیِ شوقش ز جامِ کیست در خوں طپیدہ وحشیِ من صیدِ دامِ کیست
صد جلوہ وقفِ دیدہ و دل محوِ انتظار حیرت طرازِ آئینۂ طرزِ خرامِ کیست
بے خود چو شیشہ جوش بخودی زنیم ہمہ غلیانِ شوق ایں ہمہ جوشِ مدامِ کیست

آئینہ نہ محوِ رخِ زیبائے تو بودہ ست ما را ہمہ در سر سرِ سودائے تو بودہ ست
از غنچہ و گل رازِ نہانِ تو عیان ست کیں دیدہ و دل منزل و ماوائے تو بودہ ست
داغ ست دلِ لالہ ز رشکِ رخِ خوبت ہم پائے بگل سرو ز بالائے تو بودہ ست

رفتہ ام از خویش یارب محوِ کارِ کیستم بے خودم مستم نہ دانم در خمارِ کیستم
مشعلِ طورست روشن از دلِ پُر داغِ من شعلہ با گل می کنم شمعِ مزارِ کیستم
بے خودم چوں بوئے گل پرواز ہر سو می کنم من کہ از خود رفتہ ام در اختیارِ کیستم

صیقلِ حیرت زند ہر دم بہ چشمِ انتظار — دیدہ ہا وا کردہ ام آئینہ دارِ کیستم
طرحِ صد گلشن ہم از خونِ دلِ من ریختند — این ہمہ رنگے کہ دارم از بہارِ کیستم
وحشتِ ہر سو عناں گیر است و سودا ہرزہ تاز — سر بہ صحرا دادۂ شوقِ شکارِ کیستم
ہجر دارم کشمکش ہائے قبول و ردِّ دہر — سبزۂ باغِ کیم امروز خارِ کیستم

با سوزِ دل بہ شمع و چراغم چہ حاجت است — کافی ست داغِ سینہ چراغِ مزارِ من
یارب بہ جستجوئے کہ سرگشتہ ام کہ نیست — جز گردِ باد حاصلِ مشتِ غبارِ من

چیست دانی ابروئے خوباں بہ لوحِ دل قریب — از یدِ قدرت نوشتہ مصرعِ برجستہ

تپش فرسودہ دل اندر برش ہیں — گریباں چاک و مژگاں ترش ہیں
لب از دشنام زہرے در میاں داشت — کنوں خالص عیارِ شکرش ہیں
دلش آشفتہ و طبعش پریشاں — چہ من اکنوں بہ حالِ ابترش ہیں
چہ حیرت از بیوفائے شکوہ پرداز — چہ خود نا آشنائے دیگرش ہیں

سرور :-

حکیم سید سرور حسین سرور سادات بارہ میں سے تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے اجداد جیور میں کب آ کر آباد ہوئے۔ ان کے والد میر جعفر علی صاحب بہ عہدِ نواب کلب علی خاں رام پور کے شاہی اطبا میں تھے، اور وہاں سے ان کو معقول وظیفہ ملتا تھا۔ مطب بھی کافی اچھا چلتا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کلام بیشتر رسمی ہے۔

ان کا کلام عریانی اور خالص مجازی عشق کے رنگ سے یکسر مبرا ہے اور تصوف و معرفت اور اخلاقی موعظت کے درس کی جھلک تمام کلام میں دکھائی دیگی۔

کس دل سے بھلا لے بھی کوئی نامِ محبت — آغاز ہی اچھا ہے نہ انجامِ محبت

ہیہات یہ کیسا ہوا انجامِ محبت — مرتے ہیں نہ جیتے ہی ہیں ناکامِ محبت
اُن کے سوزِ ہجر میں دل پر سوا کھائے داغ — سینۂ عشاق رشکِ صد گلستاں ہو گئے
کوئے جاناں میں گئے جو پھر نہ آئے لوٹ کر — آہ جا کر اپنے محوِ روئے جاناں ہو گئے
بلبلِ شیدا کرے گی تو بھلا کس کس کا غم؟ — سینکڑوں لگ کر یہاں ویراں گلستاں ہو گئے
عالمِ فانی میں جو پیدا ہوئے سرورؔ حسین — مر کے وہ آبادیٔ شہرِ خموشاں ہو گئے

بنے عاشق جو گل و بوئے گلزارِ عالم میں — تو پھر خوار و پریشاں صورتِ برگِ خزاں کیوں ہیں

تڑپتے ہی رہے ہر دم کسی کے دردِ فرقت میں — نہ پایا چین مطلق ہم نے زیرِ آسماں برسوں

غمِ فرقت میں دل کو کچھ سکوں ہوتا تو کیوں ہوتا؟ — ترے مجنوں کا غم مشہورِ جنوں ہوتا تو کیوں ہوتا؟
فدا ہوتا اگر فرہاد اس شیریں شمائل پر — تو اس کا دشمنِ جاں بیستوں ہوتا تو کیوں ہوتا؟
نہ تھا شیطان کی قسمت ہی میں رشتہ خاکساری کا — وہ پھر آدم کے آگے سرنگوں ہوتا تو کیوں ہوتا؟

ترے غم میں دلِ عاشق سے جو آہِ رسا نکلی — وہ گلزارِ محبت کی نسیمِ جانفزا نکلی

ملا جو روزِ ازل تھا بشر کو مایۂ عیش — وہ آہ رہزنِ چرخِ کہن نے لوٹ لیا

ہو گئے خوگرِ غم جورِ قفس سہہ سہہ کر — اب رہائی کی تمنا ہمیں صیاد نہیں

مسلکِ گریۂ شبِ غم دیدۂ پُرنم نہ تھا — صبر و تسکیں سے جو کم ہوتا وہ اپنا غم نہ تھا

نشانِ عیش و طرب محفلِ جہاں میں نہیں — مئے نشاط و خوشی جامِ آسماں میں نہیں
جو راز داں ہے چھپا رازِ عشق سینے میں — جو لطف ضبط میں ہے وہ کبھی زباں میں نہیں
خیالِ عیش و طرب دل سے دور کر سرورؔ — وہ مرد کیا ہے جفاکش جو اس جہاں میں نہیں

اثر ہوتا نہیں جب دل پہ مطلق شاہدِ گل کے — نتیجہ کیا اگر بلبل نے کی آہ و فغاں برسوں

فسانہ گرچہ تھا مشہورِ عام مجنوں کا — جہاں کو قصۂ سرورؔ ہی ہو گیا معلوم

ثروت :-

جنابہ مشرف دلہن صاحبہ۔ ثروت

نواب محمد مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی نواب محمد علی خاں رشکی کی بہن اور نواب محمد اسمٰعیل خان ایم۔ ایل۔ اے کی پھوپی۔

ان کی شادی نواب صاحب بھوپال کے خاندانی عزیز صاحبزادہ صدر محمد خاں کے ساتھ ہوئی تھی جس سے ایک لڑکا قدیر محمد خاں پیدا ہوئے۔ حسن اتفاق سے وہ بھی شاعر تھے اور آذر تخلص کرتے تھے، ان کا کلام بھی بصورت دیوان شائع ہو چکا ہے جو باوجود کوشش دستیاب نہ ہو سکا۔

جس دل نے پا لیا الم عشق احمدی —— عقدہ کھلا اسی پہ الف لام میم کا
الجھے ہیں بال بال میں مشاطہ لاکھ دل —— زلفوں کو انکی تجھ سے بنایا نہ جائے گا
قاصد کو لے کے انکی گلی کو چلے تو ہیں —— پر رشک سے گھر ان کا بتایا نہ جائے گا
نہیں مذکور ان کی قامت کا —— ہو رہا ہے بیان قیامت کا
سنبھالے سنبھلتا نہیں حشر میں دل —— ستم ہو گیا تجھ کو پہچان لینا
کیوں خیال ظلم و بیداد و جفا جاتا رہا —— کیا مرے آزار کا دل سے مزا جاتا رہا
ان کے افشاں کی یاد میں گذری —— کہکشاں دیکھنے میں ساری رات
یاد ہے مجھ کو کسی زلف گرہ گیر کا پیچ —— اور وہ یاد مرے حق میں ہے تقدیر کا پیچ
سوزش و بیتابی و اندوہ و درد و سوز و ساز —— گھر کیا ہے سب نے میرے دل میں وسعت دیکھ کر
بند آنکھ کی تو دیدۂ دل اپنا کھل گیا —— اک بجھ گیا تو جلنے لگا دوسرا چراغ
کس پتہ سے کوئی تجھے ڈھونڈے —— نقش پا بھی تو رہگذر میں نہیں

مسرّت

نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہ مرحوم کی بڑی صاحبزادی نواب محمد علیخان رنگیں کی بہن۔ اور نواب محمد اسمٰعیل خان۔ ایم۔ ایل۔ اے کی پھوپی۔

ان کی شادی نواب صاحب بھوپال کے خاندان میں صاحبزادہ عالمگیر محمد خاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کا کلام دیوان کی صورت میں شائع ہو چکا ہے جس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے۔

دیکھ کر حال پریشاں وہ مرا کہتے ہیں — الفت زلف پریشاں کا تماشہ دیکھا

دل دیوانہ اپنی زلف کا مجھ کو بنا دیا — بیٹھے بٹھائے تم نے بلا میں پھنسا دیا

بگڑ کے کہتے ہیں سنتے ہیں جب گلہ دل کا — کریں گے تیغ سے اک روز فیصلہ دل کا

نگاہ گرم سے دیکھو نہ میرے دل کی طرف — نہ ٹوٹ جائے کہیں کوئی آبلہ دل کا

ہو گئی لالہ زار کوئے مسرت
میرے داغوں کا جب شمار ہوا
خاک میں مل گئے مرے ارماں
دل ہمارا جو پُر غبار ہوا

اے خدا بخش دے مسرت کو — نہیں اور اس کا دوسرا مطلب

غیر دزد حنائے دست صنم
دل کو میرے چرا لیا کس نے
یاس و حسرت کو دل میں جانے کا
ہائے رستہ بتا دیا کس نے
میں تصور میں ان کے سویا تھا
اے مسرت جگا دیا کس نے

ایک مدت سے مرا جام ہے خالی ساقی — کیوں نہ دل رات کہے جاویں ساقی ساقی

اتنا دل عاشق کو ستاتے ہیں کہ توبہ — کچھ بھی تو یہ بت خوف خدا کا نہیں کرتے

اے مسرت ہزار رنج میں دل — شکر پروردگار کرتا ہے

بے جگر (ناخواندہ):

نام معلوم نہ ہوسکا۔ بے جگر تخلص فرماتے تھے۔ سکندرآباد وطن تھا۔ برق و تفتہ کے ہمعصر تھے۔

سودا بھی بھلا ہے سر سامانی بھی اچھی — ہاتھ آئیں وہ زلفیں تو پریشانی بھی اچھی
تا دیر رہے سامنے آنکھوں کے وہ قاتل — اے بے جگر ایسی تو گرانجانی بھی اچھی

حشم:

شیر محمد خاں نام حشم تخلص۔ دولت پور ضلع بلند شہر کے رئیس تھے، با اخلاق اور سیرت میں یکتائے زمانہ تھے۔ موصوف کا دیوان الموسوم بہ گلزارِ حشم سنہ ۱۹۱۲ء میں برن پرکاش پریس بلند شہر میں طبع ہوا۔

صبح محشر کی طرح سے غم تنہائی ہیں — کون سی رات مرا چاک گریباں نہ ہوا
گوارا کیوں نہ ہو ہم کو تحمل رنج ہجراں کا — اٹھایا کرتے ہیں سب میزباں بوجھ اپنے مہماں کا
نقدِ دل مفت کھو دیا تم نے حشم — یہی سرمایۂ توکل تھا
صبح محشر بھی تیرے بادہ خوار — اٹھیں کہتے ہوئے شراب شراب
کب تھا ترا خیال روا دارِ خواب حشم — مہماں نے میزباں کو جگایا تمام رات
اے رشکِ گل جو آنے کی تیرے خبر سنی — دل میں حشم نہ پھولا سمایا تمام رات
قفس میں بند ہوں لیکن کھلے زبانِ صیاد — پڑے رہے ہو نہ بچے زباں سنے کچھ نہ زبانِ صیاد
تجھے کیوں نہ بار بار افسوس — ہم سے روٹھے ہیں وہ ہزار افسوس
ہم ان کے صدمۂ فرقت اٹھا کے بیٹھے ہیں — جگر کو جان کو دل کو جلا کے بیٹھے ہیں
ذرا ٹھہر ملک الموت دم تو لینے دے — ہم انتظار میں اک دلربا کے بیٹھے ہیں
جس گل میں نہیں نام کو بھی بوئے وفا حیف — لو ایسے پہ یہ حضرت دل آئے ہوئے ہیں

شہرت :-

ہیرالال نام، شہرت تخلص، باپ کا نام دیوان ایدل لال، وطن خورجہ، قوم کائستھ سے تھے۔ عرصہ دراز تک ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ بعد میں ریاست الور میں دیوان ہو گئے تھے، گویا ایک سے زیادہ مفہوم میں صاحب دیوان تھے۔

اٹھا سکتے نہیں تارِ نظر بھی جب نزاکت سے ــــــ گراں کیونکر نہ گزرے اُن کو بارِ دامن کا

اک دن تو تم بھی دیکھو چل کر چمن کے اندر ــــــ چھوٹے نہیں سمانے گُل پیرہن کے اندر

بلبل کی چشمِ بد کا کھٹکا ہے میرے دل میں ــــــ اے جان! تم نہ جاؤ ہرگز چمن کے اندر

آنکھوں سے اپنی جاری دو چشمے ہیں اے ابر ــــــ رہتے ہیں ہم بھی شہرت گنگ و جمن کے اندر

نزع میں آئے مہربانی کی ــــــ ٹھہرو دم بھر کہ ہم بھی چلتے ہیں

در پہ آکر تسلی بیٹھ گئے ــــــ کچھ سنو اب کیا یہاں سے ٹلتے ہیں

غیر ملتے ہیں عطر ان کے لیے ــــــ ہم تو اپنے لہو ملتے ہیں

کس سیہ بخت کے نصیب کھلے ــــــ وہ دھوم اندازی سے ملتے ہیں

رات بھر جیسے شمع دیاں ہیں ــــــ موم کی طرح ہم پگھلتے ہیں

وصفِ لعلِ بتاں میں ہم شہرت ــــــ شعر کہتے ہیں لعل اگلتے ہیں

فیروز :-

مولوی عبدالرحمن خاں صاحب فیروز۔ وطن خورجہ۔ آپ فاضل دیوبند تھے اور خورجہ میں مطب کرتے تھے، آپ کے پاس ہمہ اوقات دوست احباب کا اجتماع رہتا تھا۔ آپ نہایت ذہین ذی علم انسان تھے، سیاسی لیڈروں کی سوانح حیات زبان پر تھی۔ اور اکثر اپنی مجلس میں ان لوگوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے ملک و ملت کے لئے قربانیاں

پیش کی ہیں۔ آپ حالات پر تبصرہ کرتے وقت غیر جانب داری کو پیش نظر رکھتے تھے۔

سنوا عشق کا درماں دیکھا — تم کو اے حضرت لقماں دیکھا
رشک تشبیہ نہ سمجھا ہم کو آکر — کیوں سوئے چشم غزالاں دیکھا
بارہا اے دلِ ناداں تجھ کو — یادِ گیسو میں پریشاں دیکھا
مر گیا رشک سے دشمن کیسا — مجھ کو جب کشتۂ احساں دیکھا
طرزِ تقریر سے سوئے دشمن — آج ہم نے رخِ جاناں دیکھا

ملتہب :-

نام محمد عنایت خاں۔ ملتہب تخلص۔ آپ اکبر پور ضلع بلند شہر کے ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ فارسی کا ایک دیوان اپنی حیات میں طبع کرا کر اپنی زندہ جاوید نشانی چھوڑ گئے ہیں۔

خالم بکوئے رہ گذرت اوفتادہ بود — آنہم صبا ز کلبہ بگردوں رسانده است
نگیرد بر زمیں یکدم قرار خون شہید انت — زبیتابی دمِ بسمل بہر سو میکند رم دارد
ہمہ زخم در جگر ہمہ ناسور شد ولے — ایں طرفہ طرزیست کہ درماں نمی کنی

بشیر :-

بشیر محمد خاں نام۔ بشیر تخلص۔ آپ موضع دولت پور ضلع بلند شہر کے رئیس تھے۔ بیشتر کلام حمد و نعت پر مشتمل ہے۔

ہوں میں شہید حوروں کی پہچان کیلئے — تربت پہ میری ڈالنا پھولوں کے ہار سرخ
لالہ نہیں کھلا ہی پہاڑوں میں اے بشیر — فرہاد کے لہو سے ہیں یہ کوہسار سرخ
شبِ معراج کی منزل کا پتہ دینے کو — مہر و مہ رہ گئے نقشِ سمِ توسن ہو کر
کثرتِ یاس سے اب ضبط کی طاقت نہ رہی — رازِ دل آ گیا لب پہ مرے شیون ہو کر

ضعف سے آہ بھی آتی نہیں کھنچکر باہر — سوزِ غم پھونک دیا تو نے سب اندر باہر
رند آتے ہیں مئے عشقِ نبی سے مدہوش — واعظ خلد سے لیجا کہیں بستر باہر

لشکرِ غم کو ہے میرے قلبِ مضطر کی تلاش — منتشر ہو جب سپہ کرتی ہے افسر کی تلاش
میری پیشانی پہ پہلے کھنچ گئے خطِ جبیں — کاتبِ تقدیر کو تا نہ ہو مسطر کی تلاش

کمالِ فقر ہے مرشد میں محو ہو جانا — یہ مجھ کو پیرِ طریقت سے کل ہوا معلوم
بشیرؔ دل سے جو پوچھا کہ کیا ہوا تجھ کو — تو آہ کھینچ کے کہنے لگا خدا معلوم

شادؔ:-

پنڈت پریم سکھ داس صاحب ساکن بلند شہری آپ انسپکٹر تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے سنہ ۱۳۱۰ھ میں چھپا ہے، افسوس اب نہیں ملتا، چند غزلیں دستیاب ہو سکیں آپ کی عمر ستر سال کے قریب تھی عرصہ سینتیس سال ہوئے انتقال کر گئے۔ خوشنویس اعلیٰ درجہ کے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

ہوش موسیٰ کے بھی بجا نہ رہے — سن کے حال اُن کی لن ترانی کا
کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے — حال ہے یہ سرائے فانی کا

یاد تیری مدام ہے مجھ کو — دل میں ہر دم قیام تیرا ہے
بند ہے راہ شادمانی کی — شادِ ناشاد غم نے گھیرا ہے

نقاب آج وہ رخ سے اُٹھائے بیٹھے ہیں — جہاں کو محوِ تماشا بنائے بیٹھے ہیں
کھٹک رہا ہے وہ آنکھوں میں غیرتِ گلشن — چمن میں ہیں لئے گل خار کھائے بیٹھے ہیں
جہاں میں وہ نہ رہے شادؔ دین و دنیا کے — جو اپنے دل کو بتوں سے لگائے بیٹھے ہیں

مفتوں ۔ ناخواندہ:۔

نام مینڈو خاں مفتوں تخلص قوم کے روغنگر تھے - ان کی تصنیف بدیہ منیر جو لطائف خیال لکھی ہے ان کی حیات میں ہی طبع ہو چکی تھی۔ خیال وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں لکھے ہیں اور صدہا شاگرد اس میدان میں چھوڑے ہیں - وہ غزل بھی کہتے تھے، اور سلام بھی - سکندرآباد ضلع بلندشہر سے ایک رسالہ موسومہ "ید بیضا" نکلتا تھا - اس میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا - بیشتر کلام ان کا ضائع ہو گیا - داغ مرحوم کے مشاعروں میں اکثر انھوں نے غزلیں پڑھی ہیں - ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی -

پہلے جو شمع آئی ہے مفتوں کے سامنے —— گویا مشاعرہ کا اسے سر کر چکے
اگر وہ جان جاں مانگے تو حاضر اپنی جاں تک ہو —— ارادہ دیکھنا ہے اس جفا جو کا کہاں تک ہو
شکوے کرتے ہو عبث مجھ سے مری جاں اٹھئے —— شاد کرتے نہیں کرتے ہو پشیماں اٹھئے
کام تدبیر سے کرتا ہوں ہزاروں سیدھے —— اپنی تقدیر سے ہو جاتے ہیں ساماں الٹے
ہم تری بزم میں سو بار اٹھے اور بیٹھے —— تو نے دیکھا بھی نہ اک بار اٹھے اور بیٹھے
زخم ناسور کے باعث ہمیں کل ہوش نہ تھا —— جب لگا مرہم زنگار اٹھے اور بیٹھے
ہم سے اتنا نہ کہا شوق سے بیٹھو مفتوں —— یار کی بزم میں سو بار اٹھے اور بیٹھے

حسن:۔

سید حسن شاہ نام حسن تخلص - خلف الصدق نواب سید میر جان صاحب سردار بہادر رئیس قصبہ جانیوہ ضلع بلندشہر مولد لقمان علاقہ کابل امام ہشتم حضرت موسیٰ رضا علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے - اور ان کے بزرگ سیدوزئی بادشاہوں کے پیر تھے۔ تاریخ بلندشہر میں انکا ذکر تفصیلی طور پر درج ہے - آپ کا کلام دستیاب نہ ہو سکا - نمونہ کے طور پر ایک شعر لکھا

جو پیش کیا جاتا ہے:۔

دانہ ملا جو خاک میں سرسبز ہو گیا ——— انساں کو چاہیئے کہ صدا خاکسار ہو

ذکی:۔

عبدالرحمن خاں نام ذکی تخلص ۔ آپ کو فن شعر میں اچھا دخل تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کا کوئی دیوان طبع ہوا یا نہیں، "دیوان چشمۂ فیض" سے بعض شعر ہاتھ آئے، جو درج کتاب ہیں۔

ناز پرور سے ہمیشہ کینہ ور رہتا ہے چرخ ——— ورنہ یوسف مصر میں آتا نہ کنعاں چھوڑ کر
گزر جا اس سے گر ہے ذکی تو نام کا خواہاں ——— کہ شہرت پائی عنقا نے جہاں میں بے نشاں ہو کر
پیری میں آنکھ کھول کے دیکھا تو کچھ نہ تھا ——— تھا موسم شباب مگر خواب کی طرح
فکر عقبیٰ کیجئے گر حوصلہ کچھ ہے ذکی ——— واسطے دنیائے دوں کے کیا جگر خوں کیجئے
دنیا سے رسم و راہ وفا اٹھ گئی ذکی ——— نافہم ہے جو کوئی کسی کا گلہ کرے
ذکی مسافر ملک فنا کو ہے لازم ——— کہ بار دوش پہ باندھے تو مختصر باندھے
دل کو عبث خیال ہے قصر بلند کا ——— جاتی ہے عمر سایۂ دیوار کی طرح

حالب ۔ روشن

روشن لال نام، حالب اور روشن دونوں تخلص فرماتے تھے۔ دہلی سے سکونت ترک کر کے بلند شہر کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔

کچھ یوں ہی نقاب اس رخ روشن سے جو سرکا ——— منہ ہو گیا فق چہرے پہ اک بار قمر کا
جاں نذر جفا سینہ نیاز صف مژگاں ——— باقی رہا اک دل سو ادھر کا نہ ادھر کا
تازہ تازہ لطف ہیں صحرا نوردی میں جنوں ——— سر پہ پڑنا دھوپ کا تلوؤں میں چبھنا خار کا

مضطر و دیدۂ نمناک و پریشاں خاطر —— کیسے ساماں سے ترا بے سر و ساماں نکلا

کیا طبیبوں سے علاج تپ ہجراں ہوگا —— اس مرض کا ملک الموت سے درماں ہوگا

وہ دیکھتے ہیں آئینہ حسرت ہے یہ مجھے —— گھر آئینہ میں کیوں نہ ہوا آفتاب کا

وہ سچا اگر آئے مرے گھر آپ سے آپ —— ابھی جاتا رہے یہ درد جگر آپ سے آپ

ضعف کہتا ہے قدم ہلنے نہ دیجے گھر سے —— پاؤں کہتے ہیں کہ چل کوچۂ جاناں کی طرف

پوچھا کہ لوگے دل تو کہا ناز سے کہ ہاں —— بوسہ طلب کیا تو یہ ہنس کر کہا نہیں

ناساز بخت و در پئے آزار آسماں —— دو روز کی حیات پہ کیا آرزو کریں

صادق :-

چھجو سنگھ نام - صادق تخلص - اجین میں وکالت کرتے تھے - رہنے والے خاص بلند شہر کے تھے، کلام سے حضرت نوح کا تتبع جھلکتا ہے - معاملہ بندی میں ابتذال کی طرف بھی قدم بہک جاتے ہیں - تاہم بعض اشعار میں محبت کی ٹیسیں ملتی ہیں -

غم و رنج و اندوہ و حرماں فقط ہیں —— تسلی مری وقت پر کرنے والے

طوطی و رقیم :-

حافظ محمد عثمان ولد حافظ محمد عمر بلند شہر کے باشندے تھے، شاگرد حضرت صمیم بلند شہری و حضرت مضطر خیرآبادی - نئی عمر میں شاعری کا شوق ہو گیا تھا عمر تقریباً ۲۱ سال تھی کہ شعر خوب کہنے لگے اور ان ہی ایام میں ایک کتاب بنام سخن طوطی مرتب کی - عمر نے وفا نہ کی شاید ۲۵-۲۶ سال کی زندگی پائی اور نوجوان ہی واصل حق ہوئے، تقریباً ۲۰ سال انتقال کو ہو گئے ہیں - نمونہ کلام یہ ہے

زمانے سے نرالا آج یہ انداز قاتل تھا —— ادھر گھائل پہ گھائل تھا ادھر بسمل پہ بسمل تھا

تمنا مرنے والے کی یہی تھی خاک ہو جانا —— نہ اٹھانے کے لائق تھا نہ دفنانے کے قابل تھا

تری مشقِ ستم ہم پر نہ تھی گر اے بتِ کافر — تو چکنا چور کیوں سنگِ ستم سے شیشۂ دل تھا
یقیں ہے دل سے خلش جائیگی نہ محشر تک — تری نگاہ کا پیکاں جو بن کے خار رہا

نہ ہوگا ہم سا زمانے میں باوفا پیدا — کہ ہم وفاؤں کے سکے بٹھاتے جاتے ہیں
خدا ہی خیر کرے آج حضرتِ طوطی — کہ آپ بزم میں اُن کی بلائے جاتے ہیں

پڑے ہیں رشکِ گلِ تر بنے لعاب کے پھول — چمن میں تھوک گیا کون جا بجا کے پھول
ہوئے حسین زمانے کے آج پژمردہ — پڑے گلے میں جو اس رشکِ ماہتاب کے پھول

جوانی کا نہ پوچھو کیا قیامت بن کے آئیگی — اٹھا رکھا ہے تم نے ایک عالم سر پہ بچپن میں

مآل دیکھ لیا زور آزمائی کا — کہ سُرخ رنگ ہوا ہے تری کلائی کا

بہم آئے دو ٹکڑے نہ آبِ تیغِ قاتل کے — پراگندہ ہوئے یوں تشنگی سے ہوش بسمل کے
پسِ مردن وہ لپٹے قبر سے میری گلے مل کے — یہ میری خاکساری رنگ لائی خاک میں مل کے

ناظر:

نام سید محمد ناظر حسین ولد سید برکت علی ساکن سکندرآباد ضلع بلند شہر۔ ریاست ٹونک میں صدر جج رہے۔ امیر لکھنوی شاگرد اسیر کے تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کا دیوان مطبوعہ سنہ ۱۳۲۳ھ میں چھپا ہے موسوم بہ تنویرِ خیال معروف بہ دیوانِ ناظر یادگار ہے۔

بحمد اللہ کہ دل فانوس ہے اُس شمعِ عرفاں کا — منوّر جس کے پرتو سے ہے منہ مہرِ درخشاں کا

ہمیں تو اتنی ہی عزت بہت ہے محشر میں — کوئی کہے تو ہمارا گنہگار آیا
ہمیں نصیب ہے صبر و جبر کے ارماں — سمجھا ہے لطف قدرت میں اختیار آیا

باوفا ہوتے ہیں انجان بڑی مشکل سے — آدمی بنتے ہیں انسان بڑی مشکل سے
بلاؤں کی ہجر میں سہہ کے ستم اے ناظر — دل کی مشکل ہوئی آسان بڑی مشکل سے

کچھ تو دیکھا ہے جو وہ آئینے کو دیکھتے ہیں — کبھی مضطر کبھی ششدر کبھی حیراں ہو کر
مسلکِ شیخ و برہمن ایک ہو جائے اگر — رشتۂ زنار میں تسبیح کا دانہ رہے
آنکھوں میں اشک قلب میں درد اور لبوں پہ آہ — اے عشق یہ سلوک کیا خوب واہ واہ

شیدا :-

شیدا۔ خورجوی نوجوان ہونہار شاعر تھے سنہ ۱۹۲۶ء میں قلیل علالت کے بعد انتقال کیا۔ آپ کے کلام میں فانی بدایونی کی طرح حزن و یاس کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

یہ نظامِ دہر یارب نہیں اس طرح گوارا — کوئی انجمن کی زینت کوئی بےکسی کا مارا
یہ بساطِ عشق وہ ہے کہ جہاں خلافِ آئیں — کوئی ہار کر بھی جیتا کوئی جیت کر بھی ہارا

ہر کسی پر داستانِ عشق دہراتا ہے دل — ایک ہی نغمہ ہے جو رات دن گاتا ہے دل
اک زمانہ ہو گیا ترکِ محبت کو مگر — اب بھی جب تم یاد آ جاتے ہو بھر آتا ہے دل
اس طرح شاید نہ بھولے جا سکیں ان کے ستم — جس طرح اپنی وفا میں بھولتا جاتا ہے دل
دیکھنا شیدا یہی ہے کیا زمینِ کوئے دوست — کیوں جبینِ شوق سے پہلے جھکا جاتا ہے دل

میں اپنے غم سے خود ہی پشیماں سا ہو گیا — یاد آ گئیں جو حسن کی مجبوریاں مجھے
دشمن فریب دے تو کوئی غم نہیں مگر — جینے نہ دیں گی دوست کی نادانیاں مجھے
ہر ہر نفس میں ہے مرے اک آتشِ خموش — بھڑکا کے دیکھتی ہیں یہ چنگاریاں مجھے

اک آرزو اک شوق اک ارمان اک امید — کیا کیا نہ بنا دل ترے انکار سے پہلے
پھر دردِ محبت کا مداوا تھا مناسب — یعنی تھی اجازت نگہِ یار سے پہلے
تو نے ہی کھلائے ہیں یہ گل ہائے تبسم — خاموش تھا گلشن تری گفتار سے پہلے
اب غم نہیں رونے کا مجھے بھی تو شیدا — ہنستا تھا بہت دیدۂ خونبار سے پہلے

قطعۂ تاریخ طبع تذکرۃ الشعراء بلند شہر موسوم بہ اسم تاریخی فروغ سلکہ

۱۳۶۵

(از تالیف لطیف حضرت سیّد حامد صاحب)

از نتیجۂ طبع وقّاد شاعر خوش فکر مایۂ نصاب کان عشق بلا جناب منشی عبدالقدیر صاحب شوخ برنی

یہ تذکرہ حامد نے کیا خوب مرتب
گلدستۂ اشعار فصیحان برن ہے
بے ساختہ دل نے دم نظارہ پکارا
کہہ دیجئے گویا چمنستان سخن ہے

از افکار طبع جناب شاعر شیوہ بیاں ماہر فن جناب منشی فیض الحسن صاحب تخلص بہ نجم بالوڑی حال بلند شہر

عجب یہ تذکرہ لکھا گیا ہے
بجا ہے گلشن بے خار کہنا
اگر پوچھے کوئی تاریخ اے نجم
تو گنج شائگاں سہ بار کہنا

۱۳۶۵ = ۳ × ۴۵۵

قطعۂ تاریخ طبع از نتیجۂ فکر حضرت خضر صاحب برنی

یہ حضرت حامد کی ہے تالیف لطیف
حالات سخندان برن اہل ہنر
اے خضر یہ ہے سال اشاعت اس کا
کہہ محفل ارباب سخن اہل ہنر

۱ ۳ ھ ۶ ۵

قطعۂ تاریخ اشاعت از فکر سلیم جناب مشہود احمد صاحب بہار برنی

قابل داد ایسے حامد ہیں
خوب لکھی کتاب رومانی
خضر برنی کی جانفشانی سے
حل ہوئیں مشکلیں بآسانی
محفل شاعراں سجائی ہے
دیدنی ہے سخن کی تابانی
شاعران بلند شہر کو آج
بخش دی ہے حیات لافانی
مطرب فکر نغمہ زن ہے بہار
کہہ دو یہ تذکرہ ہے لاثانی

۱ ۹ ۴ ۳ ۷

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶	۱۰	نظر	جگہ
۳۱	۱۳	مقدمہ	مقدر
۳۲	۱۳	چکے	سکے
۳۹	۱۱	تی	نہ
۴۳	۵	جیسے	شئے
۵۱	۳	لے	×
۶۱	۱۴	پھر	پر
۶۳	۲	گل	شکل
۶۹	۶	خدایا ترا آسرا چاہتا ہوں	کہ ساغر حشر میں [illegible] آب کوثر کے مری [illegible]
۱۶۸	۳	در	او
۱۷۰	۱۸	ہے	×
۱۷۴	۱۵	غریب	غربت
۱۸۸	۱۶	زباں	فغاں
۱۹۱	۵	الموہوم	الموسوم
۱۹۹	۱۶	لیعنی	یعنی